ہلکا پن بھی۔ہلکا پن جہاں بھی ہوادب کی وہ صنف کمزور نظر آ ئے گی شعر وادب میں ہلکے پن سے حاصل کی ہوئی مقبولیت کیا دیر پا اور قابل قدر ہو سکتی ہے۔وقت اسی کا جائزہ لیتا رہتا ہےاوراس کا ناپ تول بھی کرتا رہتا ہے''

(سفرِ نامہ،آبشارِ ادب:بی۔ڈی۔کالیہ ہمدمؔ ص۱۶۴)

بی۔ڈی کالیہ ہمدم ایک ادب شناس آدمی ہیں۔وہ شاعری اور عروض شعر سے اچھی طرح واقف ہیں۔انہوں نے فنِ عروض اور شعر پر ایک اہم کتاب 'پرندوں کا عالمی مشاعرہ' کے نام سے تخلیق کی ہے۔جس کا ہندی نام 'وشو پکھش قومی سمیلن' ہے۔اس کتاب میں انہوں نے پرندوں کے منہ سے بحور اور اوزان پر گفتگو کرائی۔یہ ایک اہم کتاب ہے شاید اس طرز کی اب تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔اس کتاب میں بحور، اوزان، ردیف، قافیہ کو سلیس انداز میں بیان کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔اس کتاب کے تعارف میں ہمدم لکھتے ہیں:

'' میں نے اپنی تازہ تخلیق ''وشو پکھش قو میسمیلن'' کی خوبیوں پر چرچا شروع کی۔وہ حیرت زدہ ہو رہے تھےاور جب میں نے انہیں بتایا کہ پرندوں کے نام سے کس طرح عروض، بحر، قافیہ اوزان، ردیف کو سلیس بنا دیا گیا ہے۔ اوراب کوئی بھی ادب میں خاص کر شاعری میں اگر ایک فیصدی بھی دلچسپی لیتا ہے تو وہ اس نظام سے آسانی سے واقف ہو سکتا ہے۔اور اگر اس کتاب کو آرام سے غور سے پڑھے تو کتاب کو مکمل پڑھنے کے بعد کم سے کم ایک صحیح شعر کہنے کی جسارت کر سکتا ہے۔''

(سفرنامہ،آبشارِ ادب:بی۔ڈی۔کالیہ ہمدمؔ ص۲۴۱)

بی۔ڈی کالیہ ہمدم کے اس سفرنامے میں فنی اعتبار سے کئی خصوصیات نظر آتی ہیں۔سفرنامے میں کسی مخصوص تکنیک کا استعمال نہیں کیا گیا ہے۔حالانکہ سفر نامے میں انہوں نے افسانوی انداز سے استفادہ کیا ہے۔ہمدم ناول نگار بھی ہے، وہ فکشن اور نان فکشن کے فن سے بہت حد تک واقف ہیں۔سفرنامہ تخلیق کرنے کے دوران ان کا اندرونی ادیب جاگ اٹھا۔ناول کی جزئیات اور افسانے کی لذّت سے ان کا سفرنامہ لبریز ہے۔سفرنامہ محض ناول یا افسانے کی خصوصیات کا مرکب نہیں ہونا چاہئے۔سفرنامہ نگار کیلئے ضروری ہے کہ وہ اپنے سفرنامے کو ناول یا افسانہ بننے سے بچائے۔لیکن ناول اور افسانے کی سی مٹھاس سفرنامے کے حسن کو دوبالا کرتی ہے۔ ان کا سفرنامہ 'آبشارِ ادب' میں جگہ جگہ افسانویت کی رعنائیاں جلوہ گر ہیں۔افسانوی بول چال کے اعلیٰ نمونے اس سفرنامے میں ملتے ہیں:

''خزاں کا موسم، پیڑ پودے لباس کو اتار کر آرام فرماتے دکھائی دیتے ہیں۔موسم جو ابھی تک کھلی دھوپ کا لطف عطا کر رہا تھا اب سرد انگڑائی لے کر تیز ہواؤں سے ہم وصل ہو کر ہلکی ہلکی برسات کے موڈ میں نظر آنے لگا۔

(سفرنامہ،آبشارِ ادب:بی۔ڈی کالیہ ہمدم۔ص۲۸۷۔۲۸۶)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''ہوائی جہاز آسمان میں اُڑ رہا تھا مگر میرے تخیل کی پرواز اس سے بھی اونچی تھی۔میں امریکہ اور لندن میں گزارے لمحوں کو ایک ایک کر کے یاد کر رہا تھا۔نیا گرا آبشار کے بالکل مقابل یادوں کے لمحات کا آبشار میرے تصورات میں ابھر آیا تھا اور ان میں ادبی واقعات اور شعراء ادبا سے ملاقات اور گفتگو کی قوسِ قزح سے الگ بیحد لطف عطا کر رہے تھے۔۔میرے سفر کے ساتھ ساتھ یہ آبشارِ ادب بھی مسلسل چلتا رہا۔''

(سفرنامہ،آبشارِ ادب:بی۔ڈی۔کالیہ ہمدمؔ۔ص۲۹۵)

لندن اور امریکہ کی سفری روداد پر مشتمل سفرنامہ 'آبشارِ ادب' تاریخی اور تہذیبی اہمیت بھی رکھتا ہے۔مصنف نے امریکہ اور لندن کے پُرکشش تاریخی مقامات کی سیر کی اور پُرکشش تاریخی منظر نگاری سے سفرنامے کی زینت بڑھادی۔ انہوں نے دورانِ سفر ہر ایک چھوٹے سے چھوٹے منظر کو بھی بڑی تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔سفرنامے میں تاریخی اور تہذیبی واقعات کو تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔امریکہ کے لبرٹی بت کے جزیرے کی سیر کی جہاں مصنف جس انداز سے خود متاثر ہوئے قاری کو متاثر کرنے میں بھی کامیاب ہوئے۔لبرٹی مجسمہ کو دیکھ کر مصنف جس کیفیت سے گزرے اس کا بیان ان الفاظ میں کرتے ہیں:

'' یہ مجسمہ دنیا کی آزادی کا پیغام دیتا ہے۔جمہوریت کا پیغام دیتا ہے۔ آزادی کتنی اہم ہے، بڑی شے ہے۔کتنی روح افزاء ہے۔زندگی کو کتنی راحت دیتی ہے۔جینے کیلئے کتنی ضروری ہے۔ان جذبات اور احساسات کو الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔اب آسمان میں اڑتے ہوئے پرندوں سے پوچھئے آپ ان شہیدوں کی روحوں سے سوال کیجئے جو اپنے ہم وطنوں کو آزادی دلوانے کیلئے بے لوث اپنی جان پر کھیل گئے۔اپنا تمام سکھ دکھ، عیش و آرام، لذتیں وطن کی خاطر قربان کر گئے۔''

(سفرنامہ،آبشارِ ادب:بی۔ڈی۔کالیہ ہمدمؔ۔ص۵۵)

سفرنامے میں ہمدم نے امریکہ کے تاریخی پس منظر پر بھی قلم اٹھایا۔ انہوں نے تاریخ کے ان اوراق کو پلٹا جن پر ملک امریکہ کی بنیاد موجود ہے۔سفر نامے میں مصنف جگہ جگہ تاریخی واقعات اور حقائق سے قاری کو آگاہ کرتا ہے کہ کس طرح مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستیں آپس میں مل کر ایک بڑے اور طاقتور ملک کی شکل اختیار کر گئیں۔ان ریاستوں سے وہی ملک بن گیا جسے دنیا امریکہ کے نام سے جانتا ہے۔اس سلسلے میں مصنف یوں رقمطراز ہیں:

'' بہت سے امریکی لوگ غیر ملکی تھے اور وہ اپنے ملک کے حکمرانکے مظالم سے تنگ آ کر اپنا وطن چھوڑ کر یہیں آ بسے تھے۔اگر یہ کہا جائے تو بجا ہوگا کہ آج کے امریکہ میں تمام شہری غیر ملکوں سے ہی آ کر بسے ہیں اور وہاں کے ریڈ انڈین کی تعداد بالکل معمولی ہے جو انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔۔ ۱۸۰۵ء میں سبسے پہلا غیر ملکی قافلہ ایڈورڈ، ڈی، لابولے ،فرانسیسی عالم، دانشور کی رہنمائی میں امریکہ آیا۔اب یہاں گھریلو خانہ جنگی ختم ہو چکی تھی۔غلامی کی پالسی کے خاتمے کا اعلان ہو چکا تھا۔ امریکہ قوم اب قومی بیداری، خوشحال اور عمارات کی تعمیر کے دور کے ساتھ ساتھ نئی ٹیکنالوجی کی طرف بڑھنے پر آمادہ ہو رہی تھی۔''

(سفرنامہ،آبشارِ ادب:بی۔ڈی۔کالیہ ہمدمؔ۔ص۵۶۔۵۷)

سفرنامہ آبشارِ ادب میں امریکہ کے مختلف جگہوں پر رونما ہوئے تاریخی واقعات کی بھی تفصیل پیش کی گئی ہے۔مصنف نے امریکہ آبشار کی سیر کے دوران ماضی کے کئی واقعات کو قلم بند کیا۔آبشار کی تاریخ اور چہل پہل کو سفرنامے میں قید کیا گیا ہے۔مصنف نے آبشار کی خوبصورتی اور دلکشی کو بڑے جاندار انداز میں پیش کیا ہے۔ہر ایک منظر کو ڈرامائی عناصر کے تحت قاری پر نچھاور کیا۔قاری سفرنامے میں ایسے بے شمار مناظر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔منظر نگاری اس کمال کی ہے کہ

پورے آب و تاب کے ساتھ قاری کو شریک کر کے مناظر قدرت کی سیر کرائی گئی ہے۔ ہمدم نے آبشار امریکہ سے جڑی حقیقتوں کو قلم بند کیا۔ زمانے میں بہت بار یہ آبشار منفی ہونے پر جم گیا تھا۔اور کبھی کبھی کچھ عجیب حادثات ابھی یہاں رونما ہوئے تھے۔ایسے تاریخی واقعات کا ذکر ہمیں کئی تاریخی کتابوں میں نہ مل پائے گا۔ان چھوٹے چھوٹے عجیب واقعات کو سفر نامہ نگار نے بڑی چابکدستی کے ساتھ قلم بند کر کے قاری کو ان سے فیض یاب کیا۔مصنف آبشار سے جڑے چند واقعات کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”۱۵دن کے برف جام کے دوران لوگ پیدل یا پھر گھوڑوں پر سوار ہو کر دریا میں اتر گئے اور دریا کی تہوں میں ۱۸۱۲ء کی جنگ کے ہتھیار، ہیرے، جواہرات، تمغے، پرانی یادگاری مصنوعات وغیرہ کو بے خوف تلاش کر کے لے جانے لگے۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق ۱۸۰۱ء سے ۱۹۸۵ء تک ۱۰ جانبازوں نے اس ندی کو پار کرنے کی کوشش کی تھی جن میں تین کی موت ہوگئی اور سات لوگ بال بال بچ گئے۔ ۱۹۸۵ء سے ۱۹۹۵ء کے درمیان بھی ۵ جانبازوں نے اس آبشار ندی کو پار کرنے کی کوشش کی، جرات کی لیکن ان میں سے دو لقمہ اجل ہوگئے اور تین زندہ واپس لوٹ آئے۔اب سرکار نے قانون بنا کر ایسی کوششوں پر مکمل روک لگادی ہے۔“

(سفر نامہ،آبشارِ ادب: بی۔ڈی۔کالیہ ہمدم۔ص ۸۰۔۸۱)

سفر نامہ نگار نے سفر نامے میں قدرتی اور فطری مناظر کی بھی مرقع کشی کی ہے۔ ہمدم ایک پر گو شاعر ہونے کے ناطے شاعرانہ مذاق بھی رکھتے ہیں۔نازک خیالی اور جذباتوں کو بیان کرنے کا ہنر ان میں خوب ہے۔ وہ جہاں گئے مناظر فطرت سے متاثر ہوئے اور اپنے تاثرات پیش کئے۔ایک باحس اور پر مغز انسان ہونے کے علاوہ مصنف قدرتی دلکشی اور دلفریب مناظر سے متاثر ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔خزاں کے موسم میں لندن کافی خوبصورت لگتا ہے۔بی۔ڈی۔کالیہ ہمدم موسم کے اس رنگ کو بڑی شاعرانہ ادا کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔موسم سے ساری زمین کی رنگت میں اضافہ ہوتا ہے۔موسم کی منظر کشی اس طرح کرتے ہیں:

”آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ زمین کے عارض (رخسار) پر خزاں میں شرم و حیا کی سرخیاں چھا گئی ہیں۔ یہ خزاں کی سرخیاں تو ہیں بلا کی سرخیاں اور اس پر یہ شعر:

اے زمین عارض یہ تیرے اُف خزاں کی سرخیاں موسموں نے کیا لیا

بوسہ تیرے رخسار کا سردی خوب پڑتی ہے اور دھوپ ندارد لیکن اب کے بار اس کے بالکلبر عکس ہوا۔موسم کے کرم سے ادبی محفلوں کا اہتمام نہایت خوشگوار رہا ہے۔“

(سفر نامہ،آبشارِ ادب: بی۔ڈی۔کالیہ ہمدم۔ص ۲۶۳)

سفر نامہ اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اس میں امریکہ اور لندن کے رسم و رواج کی بھی ہلکی جھلک ملتی ہے۔دورِ جدید کے امریکی رسم و رواج کو بھی مصنف نے پیش کرنے کی کوشش کی۔زمانہ بدل گیا لندن کے شہروں میں ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں جنہیں مشرق والے معیوب سمجھتے ہیں۔لندن کے ایک خوبصورت شہر میں مصنف اپنے بیٹے کے ساتھ چلتے ہوئے ایک عجیب و غریب رواج کی منظر نگاری سفر نامے میں کرتے ہیں۔جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بقولِ اقبال مغرب اب پورا خلاقی اور تہذیبی اعتبار سے ڈوب چکا ہے۔مصنف اس منظر کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

” یہ وہی منظر ہے جس کا ذکر میں نیو یارک کے شہر کے وزٹ کی تفصیل میں کر چکا ہوں۔یہ دوشیزائیں حسینائیں راہ چلتے کسی بھی مرد کے گلے میں باہیں ڈال کر فری ہک (مفت بغل گیری) کا تحفہ پیش کرا سے گدگدا سکتی ہیں۔اب دیکھنا تو یہ ہے کہ کوئی دوشیزہ کس نوجوان یا بزرگ سے بغل گیر ہو کر اسے رومانی بنا دیتی ہے یا پھر درمیانی عمر کی عورت کس نوجوان یا بزرگ کو ہم بغل گیری سے نوازتی ہے۔اس انقلاب کے پرستار قدر شناس زیادہ ہیں اور نقاد کم۔“

(سفر نامہ،آبشارِ ادب: بی۔ڈی۔کالیہ ہمدم۔ص ۲۸۰)

مغربی دنیا میں ایسے بے شمار غیر سنجیدہ سماجی رجحانات موجود ہیں جنہیں ہم مشرق والے خواب میں بھی جگہ نہیں دے سکتے ہیں۔ایسے کئی سماجی فعل سفر نامے میں پیش کئے ہیں جو ہم مشرق والے کرنا غیر مہذبانہ فعل سمجھتے ہیں۔مغرب کے تہذیب یافتہ لوگ انہیں بے جھجک بڑے شوق کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ وہاں فخر سے بیوی اپنے شوہر کا بستر کسی دوسری غیر عورت کیلئے سجاتی ہے۔مرد بڑے فخر کے ساتھ اپنی بیوی کے دوستوں اور یاروں سے مصافحہ کراتا ہے۔ایک اور نیا رجحان یہاں مغرب میں پیدا ہوا ہے کہ عورت عورت سے عشق کرتی ہے اور مرد مرد کے ساتھ جنسی تعلقات بناتے ہیں۔ایسے ہی ایک واقعہ کو سفر نامہ نگار نے اپنے خوبصورت سفر نامے میں پیش کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

” انہوں نے اپنی شادی کے بارے میں کہا کہ پہلی بار ایک عورتسے اتفاق سے ملاقات ہوئی اور شادی ہوگئی لیکن اس میں محبت نام کی کوئی شے نہیں تھی اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد طلاق ہوگئی۔وہ کہہ رہے تھے کہ انہیں ایسے لگا کہ وہ عورت کسی اور سے عشق کرتی ہے میں نے پوچھا وہ اور کون ہے مرد یا عورت۔بوب نے افسردگی سے جواب دیا کہ وہ شاید کسی عورت سے عشق کرتی تھی۔“

(سفر نامہ،آبشارِ ادب: بی۔ڈی۔کالیہ ہمدم۔ص ۳۰۳)

سفر نامہ آبشارِ ادب کئی اعتبار سے اہم ہے۔یہ سفری روداد پر مشتمل ہونے کے ساتھ ساتھ ایسا ایک مکمل دستاویز ہے جس میں بیک وقت ادبی محفلوں کی رعنائیاں، شہروں کی چہل پہل، تاریخ کے واقعات و حادثات، رہن سہن کے نء ے تجربات کے علاوہ مختلف شخصیات کا تعارف بھی پیش کیا گیا ہے۔سفر نامہ میں مصنف نے شعریت اور عروض پر جو بحث کی ہے وہ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔اس کے علاوہ اس سفر نامے میں متعدد شعراء کا کلام محفوظ کیا گیا ہے۔

معاصر خواتین افسانہ نگار

محمد سرور لون

اردو فکشن میں خواتین کے تعلق سے اور خواتین کے ذریعہ لکھے جانے کی روایت بہت قدیم ہے۔ ابتدائی فکشن نگار ڈپٹی نظیر احمد، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا، راشدالخیری سے منشی پریم چند اور کرشن چندر تک چلے آیئے تو ہر کسی کے یہاں عورت کا ایک مخصوص تصور ہمیں مل جاتا ہے۔ ان میں سے بیشتر مصنفین نے عورت کی تعلیم و ترقی پر زور دیا ہے۔ عورتوں کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے اُسے سماجی لعنتوں سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ اگر ہم اردو افسانہ کی بات کریں تو پریم چند سے لے کر اب تک اردو افسانے کا ایک کثیر حصہ خواتین سے کسی نہ کسی طور وابستہ ہے۔ بیشتر افسانہ نگاروں نے چاہے وہ مرد ہوں یا عورت، خواتین کو موضوع بنا کر اپنی تخلیقی قوتوں کو جلا بخشی ہے۔ افسانے کے ابتدائی نقوش سے ہی خواتین ادیبائیں اردو ادب کے افق پر نظر آتی ہیں لیکن مخصوص سماجی وثقافتی صورتِ حال کے پیش نظر ان کی تخلیقات فرضی ناموں سے شائع ہوتی تھیں۔ انیسوی صدی کے آخری آیام میں جن خواتین ناول نگاروں نے ناول تخلیق کیے ان میں سے اکثروں کی تعداد ایسی تھی جو نظیر احمد کی شخصیت اور ان کی تحریوں سے متاثر تھیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نظیر احمد نے عورتوں کی تعلیم و تربیت، خانگی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات اور اسی طرح کے عورتوں کے دوسرے مسائل کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ یہ باتیں ان ادیباؤں کو بھلی معلوم ہوئی لہٰذا انھوں نے اپنے مسائل کو کہانیوں کی شکل میں بیان کرنا شروع کر دیا۔ ’’اصلاح النساں‘‘، ’’مشیر نسواں‘‘، اور ’’آہ مظلوماں‘‘ وغیرہ ایسی ہی کہانیاں ہیں جو عنوان سے ہی موضوع کا پتہ دیتی ہیں۔ مطلب یہ کہ ان ادیباؤں نے بھی تعلیم نسواں، لڑکیوں کی کم سنی میں شادی کے مضر اثرات، مشرقی عورتوں کی روایتی پاس داری اور گھریلو مسائل کو اپنا موضوع خاص بنایا۔

افسانے کا ذکر کریں تو خواتین افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہے۔ حجاب امتیاز علی، نذر سجاد حیدر، رشید جہاں، عصمت چغتائی، صالحہ عابد حسین اور وہ افسانہ نویس خواتین جو ترقی پسند تحریک کے زمانے میں منظر عام پر آئیں، انھوں نے بھی عورتوں کے مخصوص مسائل پر بحث کیں۔ پہلی بار مکمل طور پر افسانے کے اجزائے ترکیبی رشید جہاں کے افسانوں میں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ وہ افسانہ نگار خاتون ہے جنھوں نے ’انگارے‘ میں لکھا اور اس وقت لکھا جب عورت کو آج کی طرح اظہار خیال کی آزادی حاصل نہیں تھی گویا رشید جہاں نے عورتوں کو سماج سے آنکھ ملا کر باتیں کرنے پر آمادہ کیا۔ رشید جہاں کا اثر عصمت چغتائی پر نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

نصف صدی پہلے جس انگارہ کو رشید جہاں نے روشن کیا اسے شعلہ میں تبدیل کرنے میں عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، رضیہ سجاد ظہیر، ممتاز شیریں نے اہم کارنامہ انجام دیا۔ ان ادیباؤں کی تخلیقات کا وافر حصہ عورتوں کے مسائل سے مملو ہیں۔ اس معاملے میں قرۃ العین حیدر اور خالدہ حسین کے افسانے اہمیت کے حامل ہیں اس لیے کہ انھوں نے بین الاقوامی مسائل کو بھی پیش نظر رکھ کر اپنی تحریروں میں ہیئت و تکنیک کی سطح پر نئے نئے تجربے بھی کیے۔

ابتدائی دور کی خواتین تحریروں میں اپنا نام ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتی تھیں اور وہ اپنے نام کی جگہ کوئی فرضی یا بنت فلاں لکھتی تھیں۔ لیکن جب خاتون قلم کار بے باک ہوئیں تو اس درجہ کہ رشید جہاں اور عصمت چغتائی کی صورتوں میں ہمارے سامنے آئیں، جن کے افسانوں کو پڑھنا کبھی معیوب، کبھی اخلاق کے خلاف سمجھا گیا اور کبھی کفر کا فتویٰ صادر کر دیا گیا۔ آج کی خاتون افسانہ نگار نہ تو خفیہ طور پر لکھ رہی ہے بلکہ وہ فخریہ لکھتی ہیں اور اب ان کا لکھنا باعث عزت سمجھا جاتا ہے۔ پہلے صرف اچھے یا بڑے گھرانوں کی عورتیں لکھا کرتیں تھی لیکن آج تعلیم کے عام ہونے کی وجہ سے ہر طبقہ اور سماج سے خاتون قلم کار سامنے آرہی ہیں۔ یہ سماجی اعتبار سے ایک بڑی تبدیلی ہے۔

ہر دور کا ادب اپنے سماجی، معاشی اور سیاسی نظام و صورتحال کی عکاسی کرتا ہے۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ خواتین افسانہ نگاروں کے موضوعات میں تنوع اور رنگا رنگی بھی پیدا ہو رہی ہے۔ ابتدا میں خواتین، اکثر خواتین ہی کے موضوعات تک محدود رہتی تھیں رفتہ رفتہ ان کے موضوعات میں وسعت اور تنوع پیدا ہونے لگا۔ آج کا مصنف آزاد ہے وہ کسی بھی نظریے، تحریک میں قید نہیں ہے۔ اسے فکری آزادی ہے۔ دنیا کے عالمی گاؤں میں تبدیل ہو جانے کے سبب اور انفارمیشن ٹکنالوجی کی برکتوں کے باعث تمام دنیا کے موضوعات کو اپنی کہانیوں میں سمیٹتا ہے۔ آج خواتین افسانہ نگاروں کے یہاں بھی سماجی حیثیت پائی جاتی ہے اور معاصر معاشرہ ان کے افسانوں میں زندہ اور متحرک نظر آتا ہے۔

یہ خاصیت عصر حاضر کی خواتین افسانہ نگار کے افسانوں میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ انھوں نے آج کے مسائل سے اپنی کہانیوں کے لیے موضوعات کا انتخاب کیا ہے اور زیادہ تر خواتین نے روایتی عشق و محبت کی داستانیں نیز سراسر تجریدی اور علامتی حکایتیں بیان کرنے سے گریز کیا ہے۔ انھوں نے بیانیہ انداز اختیار کر کے اپنی کہانیوں میں زندگی کے مختلف رنگوں کو فطری انداز میں دکھانے کی کوشش کی ہے۔ ذکیہ مشہدی، ترنم ریاض، قمر جہاں، شائستہ فاخری، قمر قدیر ارم، غزال ضیغم، ثروت خان، صبیحہ انور، تبسم فاطمہ، تسنیم کوثر، قمر جمالی، عنبری رحمان، افشاں ملک وغیرہ عہد حاضر کی وہ خاتون افسانہ نگار ہیں جن کی تخلیقات موضوعاتی اور ادبی سطح پر بحث کا موضوع بنی ہیں۔ ان فسانہ نگاروں کے ہاں فنی اور موضوعاتی دونوں سطح پر نئی پرانی روایتوں کا حسین امتزاج اور کہانیوں کا نیا رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔

عصر حاضر کی خواتین افسانہ نگاروں میں ذکیہ مشہدی ایک اہم اور معروف افسانہ نگار ہیں۔ حالاں کہ انھوں نے ۱۹۸۰ء سے پہلے افسانہ نگاری کا آغاز کیا تھا لیکن اس کے بعد وہ برابر لکھتی رہی۔ ان کے ابھی تک پانچ افسانوی مجموعے

شائع ہو چکے ہیں۔ جن کے نام ''پرائے چہرے'' (۱۹۸۴ء)، ''تاریک راہوں کے مسافر'' (۱۹۹۳ء)، ''صدائے بازگشت'' (۲۰۰۳)، ''نقش ناتمام'' (۲۰۰۸ء)، اور ''یہ جہاں رنگ و بوؤ'' (۲۰۱۳ء) ہیں۔ یوں تو ان کے موضوعات میں تنوع بہ آسانی تلاش کیا جاسکتا ہے۔ مٹتی ہوئی تہذیبی قدریں، آگے بڑھتی ہوئی زندگی اور اس کی دھول میں گم ہوتے رشتے، فرقہ واریت، فسادات، اپنوں کی بے اعتنائی کی شکار اردو زبان کی زبوں حالی اور سماجی تفریق وغیرہ ان کے خاص موضوعات ہیں۔ انھوں نے سماجی موضوعات پر دل کھول کر لکھا ہے۔ افسانہ ''افعی'' اس کی تازہ مثال ہے۔ اس افسانہ میں یوں تو انھوں نے کالج کی زندگی اور نئے طلبہ کی ریگنگ کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی تہہ تک پہنچنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اقلیتی کردار کے حوالے سے یہ کہانی لکھی گئی ہے۔ کالج کی زندگی میں ایک مسلم طالب علم کو کیا کچھ جھیلنا پڑھتا ہے، سبھی کچھ اس میں اشاروں میں بیان ہوا ہے۔

ذکیہ مشہدی نے اپنے بیشتر افسانوں میں اپنے عہد کی عورت کو پیش کیا ہے۔ 'پرائے چہرے'، 'ایک تھکی ہوئی عورت'، 'آنٹی'، 'چرایا ہوا سکھ' جیسے افسانوں میں انھوں نے عورت کے ہر طرح کے مسائل اور دکھ درد کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے دور حاضر کی عورت کو روزمرہ کے گزرے لمحات میں حقیقت کے قریب کر کے ادبی تناظر میں پیش کیا ہے۔ ذکیہ مشہدی عورتوں کی نفسیات کی ترجمانی جس با کمال طریقے سے کرتی ہیں وہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ اس کے علاوہ بابری مسجد کے انہدام کے المیے کا ذکر بھی اس میں ہے۔ ذکیہ مشہدی کے ان افسانوں کے علاوہ کئی اور افسانے ہیں جن میں انھوں نے بین الاقوامی مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نئے اور پرانے تہذیبوں کی تصادم پر بھی ان کی گرفت مضبوط ہے۔ موتیا کی خوشبو، بلیاں، حساب، پرستش، محمود ایاز اور بلی کا بچہ وغیرہ ان کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔ ذکیہ مشہدی کو زبان پر قدرت حاصل ہے، وہ کلاسیکی ہنرمندی سے شستہ اور شگفتہ کہانیاں لکھتی ہیں۔

ترنم ریاض ہم عصر خواتین افسانہ نگاروں میں ایک منفرد مقام رکھتی ہیں۔ ان کے ابھی تک چار افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ترنم ریاض کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''یہ تنگ زمین'' ۱۹۹۸ء، دوسرا ''ابابیلیں لوٹ آئیں گی'' ۲۰۰۰ء، تیسرا ''یمبر زل'' ۲۰۰۴ء، میں اور چوتھا مجموعہ ''میرا رختِ سفر'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ ترنم ریاض کے افسانوں میں عورت کے جذبات و احساسات، ان پر ہوئے مظالم، محرومیاں، آنسوں اور کرب کا ذکر بار بار آتا ہے۔ افسانہ ''ناخدا'' اس کی مثال ہے۔ ان کے موضوعات کا کینوس بڑا وسیع ہے۔ رنگ و نسل، حسب نسب، طاقت، جہالت، سیاست، ملکی و عالمی مسائل، ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز ان کے افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔ اس کے علاوہ کشمیری زندگی، وہاں کے عوام کا درد، کرب و مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں خاندانی زندگی کے مختلف Shades کو بڑی کامیابی کے ساتھ اجاگر کیا ہے۔ اس کی مثال ان کے افسانے 'پورٹریٹ'، 'حور' اور 'گلچھیں' میں بخوبی ملتی ہے۔ افسانہ ''پورٹریٹ'' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں ساس بہو کے رشتے دوسرے عزیزوں کے ذریعے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ساس کی حد سے زیادہ سختی کی وجہ سے بہو اور بیٹے کی ازدواجی زندگی خوف ناک حد تک اذیت ناک بن جاتی ہے لیکن بہو سب کچھ برداشت کرتی ہے، صبر و تحمل سے کام لیتی ہے اور گھر کے ماحول کو خراب ہونے نہیں دیتی۔ افسانہ ''حور'' میں ایک کشمیری خاندان کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس خاندان میں شریفہ اور حور دو بہنیں ہیں۔ دوسرا خاندان ایک لکڑی کے کاری گر کا ہے جہاں غریبی اور مفلسی سے حالات بدتر ہیں۔ بڑی لڑکی کی شادی ایک غریب گھرانے کے لڑکے سے ہو جاتی ہے۔ جب کہ 'حور' کی شادی ایک گونگے شخص سے ہو جاتی ہے جو اس کے والد کی دوکان پر کام کرتا ہے۔ افسانہ نگار نے گھر کے شادی کے ماحول کو کشمیری رسم و رواج کے حوالے سے پیش کیا ہے:

''وقفہ وقفہ کے بعد کوئی خاتون آتی اور دلہن کے سامنے رکھی ہوئی کانگڑی میں اسپند کے دانے ڈال جاتی ایسے میں کانگڑی کے ساتھ بندھی ''ژالن'' سے آگ کو ہلاتی اور دانے آگ سے چھوتے ہی چیخ چیخ کر فضا میں خوشبو بکھیر دیتے۔'' (مجموعہ یہ تنگ زمین، ص:۶۱)

افسانہ ''گلچھیں'' بھی ایک گھریلو سطح کا افسانہ ہے۔ بظاہر یہ دو چھوٹے بچوں کی نفسیات پر مبنی ہے لیکن خاتون خانہ کے صبر و ایثار کو بڑی باریکی سے دکھایا گیا ہے۔ اس کو گھر میں ہر طرح سے ستایا جاتا ہے۔ نتیجتاً وہ اپنے دونوں بچوں کو چھوڑ کر مائکے چلی جاتی ہے۔ بڑے بچے کی پرورش توجہ کی ساتھ کی جاتی ہے جب کہ دوسرا بچہ افرادِ خاندان کی شفقت و محبت سے محروم رہتا ہے۔ اس کا خیال گھر میں کوئی نہیں رکھتا۔ جس کی وجہ سے اس میں ضد و بغاوت کا جذبہ پنپنے لگتا ہے۔ ترنم ریاض نے بڑے فنکارانہ طریقے سے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بچوں کے تئیں ماں باپ اور دیگر افرادِ خاندان کا خراب رویہ ان کی زندگی کو متاثر کرتا ہے اور اس میں نفسیاتی کج روی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے دوسرے افسانوں میں بھی یہی صورتحال دکھائی دیتی ہیں محدود صفحات میں یہاں ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ ان کا امتیاز یہ ہے کہ موضوعات ہزار گھریلو انداز کے ہوں، رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ ہو، زن و شوہر کے درمیان کی کشمکش ہو یا پھر کشمیر کا مسئلہ ہو وہ بڑی آسانی سے اسے ایک انسانی مسئلے کی شکل دے دیتی ہیں۔

ترنم ریاض کے افسانوں کی خاصیت یہ ہے کہ ان کے افسانوں کا ابتدائیہ اور خاتمہ چونکا دینا والا ہوتا ہے۔ طارق چھتاری ان کی افسانہ نویسی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

''ترنم ریاض کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے افسانوں کے بیشتر کردار، واقعات اور مناظر سب سے پہلے قاری کے دل پر اثر انداز ہوتے ہیں پھر فہم و دانش سے لبریز ہو جانے والے دل سے پھوٹتی شعائیں اس کے ذہن کو بھی منور کر دیتی ہیں اور خود کو افسانے کا ایک کردار سمجھ کر افسانہ نگار کے تخلیقی عمل میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہ فن کی معراج ہے، اس کی کسوٹی پر ترنم ریاض کے افسانے پورے اترتے ہیں۔'' (شعر و حکمت'' دسمبر ۲۰۰۶، ص ۳۵۶)

قمر جہاں بھی نئی نسل کی ایک معتبر آواز بنتی جا رہی ہیں۔ ان کے چار افسانوی مجموعے چارہ گر، اجنبی چہرے، حرف آگہی اور یاد نگر کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ خود اپنے افسانوں کے بارے میں لکھتی ہیں:

''یہ کہانیاں چونکہ جاگتی آنکھوں کا خواب ہیں اس لیے ان میں خواب سے زیادہ حقیقت کا رنگ ہے۔ زندگی کی ٹھوس اور کٹیلی حقیقتیں۔ اس طرح جو بھی کہانیاں لکھ رہی ہوں ان میں فنکاری ہے یا نہیں یہ تو آپ ہی بتا سکتے ہیں لیکن حقیقت کا وہ روپ ضرور موجود ہے جس نے میری روح کو زخمی کیا، میرے احساس میں کرچیاں چبھودی

ہیں۔" مرتب ڈاکٹر نعیم انیس، اردو کی معروف خواتین افسانہ نگار اور ان کی خدمات، ص:۵۰

قمر جہاں کے افسانوں میں زندگی بالخصوص عورتوں کی زندگی کے مختلف جہات پر توجہ ملتی ہے۔ عورتوں کے دکھ سکھ، خوشیوں، محرومیوں، خواہشوں اور بنتے بگڑتے رشتوں کو انھوں نے اپنے مشاہدے و تخیل کے کینوس پر اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ان کے افسانوں میں تہ داری نہیں ہوتی، بلکہ راست بیانیہ انداز میں بڑی معصومیت کے ساتھ وہ انسان کے داخلی و خارجی مسائل کی تصویر کشی کرتی ہیں۔ 'انتظار'، 'آج کی عورت'، 'بند کوٹھری' اور 'آندھی' وغیرہ ان کی اہم کہانیاں ہیں۔

موجودہ افسانوی منظرنامے میں ایک اہم نام نگار عظیم کا بھی ہے۔ ان کے افسانوی مجموعے "عکس"، "گہن" اور "عمارت" شائع ہو کر ادب کے سرمایہ میں اضافہ کر چکے ہیں۔ نگار عظیم بھی اپنی کہانیوں میں عورت کو مرکزی حیثیت دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورتوں کے حالات و کوائف سے متاثر ہوتے سماجی و تہذیبی حالات وہ مسائل کے رنگ ہیں تو وہیں سماجی و تہذیبی قید بندیوں سے جدوجہد کرتی اور باغی مزاج کی عورت بھی ہے۔ ان کے افسانوں میں عورتوں کے مختلف النوع روپ دکھائی دیتے ہیں۔ نگار عظیم کے افسانوں میں نئی نسل کی تعلیم یافتہ لڑکی کی سرکشی، بے باکی، خود آگہی، اور خود اعتمادی کی تصویروں کی جھلک ملتی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ "عورت ظلم سہے گی تو ظلم ہوتا رہے گا، ظلم کے خلاف آواز بلند کرے تو ظلم بند ہو جائے گا۔" مگر عورت ہونے کی وجہ سے وہ دھرتی اور ماحول سے جڑی ہوئی ہیں اور انھیں اس پر ناز بھی ہے۔

نگار عظیم کے افسانوں میں رشتوں کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ ایک عورت رشتوں کے تئیں کتنی حساس ہوتی ہے، اس کی عکاسی نگار عظیم کے ہر افسانے میں کم و بیش دیکھی جا سکی ہے۔ افسانہ 'گہن'، 'کنفیشن' اور 'تکمیل' میں رشتوں کے بدلتے معیار کی خوشبو محسوس کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے عورتوں کی نفسیات پر بھی افسانے لکھے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا افسانہ 'فرق' اہم ہے۔ اس افسانہ میں ایک طرف عورت کی محبت کا تقدس اور دوسری طرف اس کے کردار کی عظمت۔ تخلیق کار نے عورت کی مزاج کے ان دونوں پہلوؤں کو سادگی اور مہارت سے پیش کیا ہے۔ افسانہ 'کسک' بھی عورت کے کردار کی بلندی کو موضوع بنا کر لکھا گیا ہے۔

غزال ضیغم کا نام اس ضمن میں کافی اہمیت کا حامل ہے ۲۰۰۰ء میں افسانوں کا اکلوتہ مجموعہ "ایک ٹکڑا دھوپ کا" شائع ہوا۔ اس مجموعے کے "سوریہ ونشی چندرونشی"، "مدھوبن میں رادھیکا" اور "ایک ٹکڑا دھوپ کا" جیسے افسانے قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا کینوس کافی وسیع ہے۔ وہ نئے موضوعات کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہے۔ افسانہ "مدھوبن میں رادھیکا" موضوع کے تنوع کے ضمن میں اہم ہے۔ اس افسانے میں نجمہ باجی کا کردار ماڈرن عورت کا استعارہ ہے جن کی شخصیت میں سگریٹ پینا، مردوں کے ساتھ اختلاط، شوہر کے ہوتے ہوئے تنہائی کی سی زندگی گذارنا اور اس طرح کی دوسرے خصائص شامل ہیں۔ جب کہ ان کو مردوں سے شدید نفرت ہے اور اس بات کا اندازہ ان کی تحریروں سے بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ ساجد جیسے شریف النفس آدمی کے ساتھ غلط کرنا اس کی زندگی کا خاصہ بھی ہے۔ عورت، غزال ضیغم کے افسانوں کا محبوب استعارہ ہے۔ ان کے افسانوں میں عورت کا روپ ہر طور نظر آتا ہے۔ افسانہ "خوشبو" میں ایک بہن، ماں کے روپ میں ہے اور وہ اپنی والدہ کی وفات کے بعد بھائی کی ہر بات کا خیال رکھتی ہے تو افسانہ "بے دروازے کا گھر" میں ایک عورت خود کفیل ہے اور اپنی آنکھوں سے دنیا دیکھنا چاہتی ہے وجہ صرف یہ ہے کہ لوگ اسے حقیر و کمتر سمجھتے ہیں لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔

افسانہ "زندہ آنکھیں مردہ آنکھیں" میں غزال ضیغم نے عورت کی ہمت و جرأت کو کہانی کا موضوع بنایا ہے۔ غزال ضیغم نے اس افسانہ میں بڑی عمدگی کے ساتھ معاشرتی نظام کی تصویر کشی کی ہے۔ خاندانی روایتیں، عداوتیں، رنجشیں کیسے خاندان کے خاندان تباہ کر دیتی ہیں؟ فرح کے سامنے جب اس کے بھائی کا گولیوں سے چھلنی جسم آتا ہے تو جہاں وہ فطری طور پر ٹوٹتی ہیں، غم میں ڈوب جاتی ہیں، وہیں اس کے اندر ہمت و حوصلے کی ایک مضبوط لہر اٹھتی ہے۔ اپنے بھائی کے دونوں بچوں کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی وہ ایک نیا قدم اٹھاتی ہے:

"دونوں بچے سہم کر پھوپھی سے لپٹ گئے۔ اس نے ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر بھیڑ کی طرف منہ کر کے سرخ آنکھوں سے مخاطب ہوئی۔ "اب میں مقدمہ لڑوں گی۔ دنیا کی اس عدالت سے اس عدالت تک۔" اس کے چہرے پر گہرے عزم کی چھاپ اور آواز میں چھپی تاثیر دیکھ کر خاندان کے سارے زندہ لوگوں کی آنکھیں مردہ ہو گئیں۔" (افسانہ 'زندہ آنکھیں مردہ آنکھیں' ایک ٹکڑا دھوپ کا، غزال ضیغم، ص:۸۳)

افسانہ 'خشبو' بھی ان کا ایک اہم افسانہ ہے جس میں خاندانی زندگی کے توسط سے دو حصوں میں بٹے ہوئے خاندان کے کوائف کا بیان ہے۔ افسانہ کا ایک حصہ ہندوستان کے حالات سے متعلق ہے اور دوسرا مغربی ممالک کی چمک دمک کے پیچ وخم پر مبنی ہے۔

ثروت خان نے ۲۰۰۰ء کے آس پاس سے افسانہ لکھنا شروع کیا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ "ذروں کی حرارت" ۲۰۰۴ء میں منظر عام پر آیا۔ ترنم ریاض کے بعد وہ دوسری افسانہ نگار ہیں جنھوں نے علاقائیت کو اپنے افسانوں میں فروغ دیا۔ اردو ادب میں راجستھان اور وہاں کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں ملتا۔ ثروت خان نے ان امور پر توجہ دی اور اپنے افسانوں کا محور قرار دیا۔ ان کے یہاں براہ راست خاندانی زندگی کا بیان بہت کم ہے جو کچھ بھی ہے وہ راجستھانی کلچر کی پیش کش کے تئیں ہے۔

ثروت خان کا افسانہ "میں مرد مار بھلی" بنیادی طور پر عورتوں کی نفسیات اور ازدواجی زندگی میں ان کے استحصال سے عبارت ہے۔ انھوں نے کیرتی اور سنبل دو کرداروں کے ذریعے کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔ سنبل کو اس کا شوہر شراب کے نشے میں زدوکوب کرتا ہے، جب کیرتی اسے پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے تو سنبل بیچ میں آ کر کہتی ہے:

"نہیں کیرتی نہیں! یہ میرا مجازی خدا ہے۔ تم بیچ میں نہ آؤ۔" (ذروں کی حرارت، ص:۱۳)

کیرتی سنبل کی بات سن کر جواب دیتی ہے:

"سنبل پتی پرمیشور ہمارے یہاں بھی ہوتا ہے لیکن یہ سب القاب ان مردوں نے ہم عورتوں پر ظلم کرنے کے لیے گڑھے ہیں۔ خود مختاری میں خدا اور پرمیشور بن بیٹھے اور

ہمیں ابلا اور صنف نازک قرار دیا۔ یہ سب ڈھونگی ہیں۔ پکے ڈھونگی۔'' (ذروں کی حرارت، ص۱۴۴)

یہ افسانہ عورتوں کے گھریلو مسائل اور ازدواجی زندگی کی دشواریوں کا غماز ہے۔ اس میں وہ آزادیِ نسواں کی طرف بھی قدم بڑھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ کہانی ہندوستانی سماج میں عورتوں کے دو متضاد رویوں کو پیش کرتی ہے لیکن دونوں ہی رویے طے شدہ ذہنیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے دیگر افسانوں میں بھی خاندانی زندگی کی ایسی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

شائستہ فاخری کے افسانوں میں مخصوص سماجی و تہذیبی تناظر، عورت و مرد کے تعلوقات، سیاسی گراوٹ معاشی بدحالی، تہذیبی پستی، معاشی ابتری، گھریلو مسائل اور ازدواجی زندگی کی ذلتوں کا بیان جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ شائستہ فاخری ایک حساس خاتون ہیں۔ وہ اپنی ہم جنسوں کے معاملات و مسائل سے اچھی طرح سے واقفیت رکھتی ہیں۔ اس لیے ان کے افسانوں میں عورت ہر روپ میں نظر آتی ہے۔ کہیں ماں کی شکل میں ممتا کے جذبہ سے سرشار، کہیں بیوی کے رنگ میں وفا اور محبت کی بے مثال تصویر، تو کہیں دھوکہ کھائی ہوئی محبوبہ اور کہیں زمانے کی مظلومیت کی شکار بنت حوا کی شکل میں موجود ہے۔ شائستہ فاخری کے بعض افسانوں کو کردار کے افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی قوتِ مشاہدہ اور جزئیات نگاری میں چابک دستی کی داد دینا پڑتی ہے۔ شائستہ فاخری کے افسانوں کے کرداروں میں کنور فتح علی، صوفی آپا، جھبری، منگلا، زینی، تازارا ایسے کردار ہیں جن کی دنیاؤں کا بڑا عمیق مطالعہ انھوں نے کیا ہے۔ شائستہ فاخری نے عورتوں کے مسائل کے علاوہ دوسرے معاشی و معاشرتی مسائل کو بھی موضوع خاص بنایا ہے۔ ہندوستان میں ہونے والی دہشت گردی پر بھی انھوں نے متعدد افسانے لکھے ہیں۔ ان افسانوں میں ''آفندی کا بیٹا''، ''کلر بلائنڈ''، ''آزاد قیدی'' وغیرہ ایسے عمدہ افسانے ہیں جن میں کئی معنویتوں کا ایک نظام پوشیدہ ہے۔ انھوں نے ان موضوعات کے علاوہ جنسیات کی دنیا کی بھی سیر کی۔ ''اداس لمحوں کی خود کلامی'' ہم جنسیت پر لکھا ہوا اچھا افسانہ ہے۔ ''کنور فتح علی'' اور ''ریچھ'' میں بھی جنسیات کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

دور حاضر کی خواتین افسانہ نگاروں میں کہکشاں پروین کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا تعلق بہار سے ہے۔ بہار میں کہکشاں کے نام سے دو خواتین افسانہ لکھ رہی ہیں، کہکشاں پروین اور کہکشاں انجم۔ کہکشاں پروین کے اب تک چار افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'ایک مٹی دھوپ' ۱۹۸۶ء، دوسرا افسانوی مجموعہ ۱۹۹۰ء، تیسرا افسانوی مجموعہ 'سرخ لکیریں' شائع ہوا جب کہ ابھی تک کا آخری اور چوتھا افسانوی مجموعہ ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا جس میں کل ۱۸ کہانیاں شامل ہیں۔ گویا اب تک ان کی ۶۰ سے زائد کہانیاں صرف افسانوی مجموعوں میں شائع ہو چکی ہیں جب کہ تقریباً تمام اہم رسائل میں بھی وہ تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہیں ہیں۔ ان کے مشہور و مقبول افسانوں میں 'داتا'، 'بھانو'، 'پانی کا چاند'، 'تواپر کی عورت'، 'گرتی ہوئی عمارت' اور 'سرخ لکیریں' وغیرہ کو خصوصی اہمیت اور امتیاز حاصل ہے۔ 'داتا' تنہا عورت پر سماج کے مظالم، رسم و رواج کی دخل اندازی اور فرسودہ خیالات کے نتیجے میں پھیلنے والے انتشار کی کہانی ہے۔ افسانہ 'بھانو' میں ایک لڑکی کے موثر کردار کی پیش کش کے ذریعہ آدی باسی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے۔ 'پانی کا چاند' سرکاری تعلیمی مہم کے فریب کی کہانی ہے اور 'تواپر کی عورت' میں عورت اور مرد کے آپسی روابط کا اظہار ہے۔

کہکشاں انجم کے دو افسانوی مجموعے 'کہکشاں' اور 'کرچیاں' منظر عام پر آچکے ہیں۔ کہکشاں انجم نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی زبوں حالی کو موضوع بنایا ہے۔ وہ عورتوں کے استحصال کے معاملات پر گہری نظر رکھتی ہیں اور سماج میں ان کی پوزیشن پر خلاقانہ نظر ڈالتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں اختصار دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ جامعیت کے رمز سے آشنا ہیں اور افسانے میں فنی برتاؤ کی سوجھ بوجھ رکھتی ہیں۔

عصر حاضر کی خواتین افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام تبسم فاطمہ کا بھی ہے۔ ان کے افسانے تقریباً تین دہائیوں سے رسائل میں شایع ہو رہے ہیں اور ایک مجموعہ بھی 'لیکن جزیرہ نہیں' کے نام سے منظر عام پر آچکا ہے۔ تبسم فاطمہ احتجاجی ذہن رکھتی ہیں یہ الگ بات ہے کہ یہ احتجاج عورتوں کے مسائل تک محدود ہے۔ ان کے افسانوں میں نئی عورت کا باغی روپ ملتا ہے اور یہ روپ کہیں کہیں جارحانہ رخ اختیار کر لیتا ہے۔ نیا قانون اور جرم جیسے افسانوں میں انھوں نے عورت کو نیک پروین کے بجائے ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور سوال اٹھائے ہیں کہ

''مرد ہر بار سورای کیوں کرتا ہے؟''

''عورت! اسے خود سے شدید نفرت کا احساس ہوا، ایسا کیوں ہے؟ عورت ہر معاملے میں زندگی کے ہر موڑ میں تقدیس کی گرد جھاڑتے ہی چت کیوں ہو جاتی ہے؟ ایک دم سے چت اور ہاری ہوئی۔ مرد ہی جیتتا ہے اور عورت چاہے کتنی بڑی کیوں نہ؛ ہو جائے اندرا گاندھی سے مارگریٹ تھیچر تک۔۔۔۔ عورت کی عظمت کہاں سو جاتی ہے؟ (جرم)

یعنی تبسم فاطمہ کے یہاں عورتوں کے روایتی یا بنیادی مسائل مثلاً جہیز، طلاق، سسرال یا شوہر کی زیادتی کے مسائل جیسے موضوع نہیں ہیں۔ ان کے یہاں عورت کا الگ ہی تصور ہے کہ اکیسویں صدی کی عورت کو کیسا ہونا چاہیے؟ وہ عورت کو اس کی طاقت کا احساس دلانا چاہتی ہیں جس سے کام لے کر وہ سماج، معاشرے اور پوری دنیا کو بدل سکتی ہے۔ یہی فکر تبسم کو دوسری افسانہ نگاروں سے منفرد بنا کر انہیں امتیاز بخشتی ہیں۔

افسانوی ادب کے منظر نامے پر تسنیم کوثر کا نام بھی کندہ ہے۔ یہ بھی عورتوں کی ہی کہانیاں لکھتی ہیں، مگر ان کی سوچ مثبت ہے اور وہ انسانی رشتوں کی اہمیت پر اسرار کرتی ہیں۔ تسنیم کوثر کے بیشتر افسانوں میں ہمارے سماج میں عورتوں کے استحصال، عورتوں کے جذبات و محسوسات کی عکاسی نظر آتی ہے۔ نیز عورتوں کے درد و غم، ظلم و ستم، داخلی اور خارجی کیفیات پر بھی ان کی نگاہ رہتی ہے۔

مذکورہ خواتین افسانہ نگاروں کے علاوہ اور بھی بہت ساری خواتین قلمکار ہیں، جو تسلسل کے ساتھ لکھ رہی ہیں۔ لیکن مقالے کی طوالت کو دیکھتے ہوئے راقم الحروف کو ان کے نام سے ہی اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہاں پر ان کا تفصیلی تعارف پیش کرنا مشکل ہے۔ لہٰذا ان قلم کاروں کے نام درج کیے جا رہے ہیں۔ جن میں شمیم نگہت، ذکیہ ظفر، بانو سرتاج، حاجرہ شکور، افشاں ملک، انور نزہت، انبری رحمان، صبیحہ انور وغیرہ بے شمار کہانی کار ایسے ہیں جنھوں نے اردو افسانہ کے باب میں مزید اضافہ کیا ہے اور اردو افسانہ کو نت نئے تخلیقی تجربے سے مالا مال کیا ہے۔ ●●

اردو زبان و ادب پر مواصلاتی نظام کے منفی اثرات

ڈاکٹر محمد اقبال خان

موجودہ دور کو سائنس و ٹیکنالوجی کا دور کہا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کے آخری چند سالوں اور اکیسویں صدی کے آغاز سے دنیا بھر میں مواصلاتی ٹیکنالوجی جیسے کمپیوٹر، ٹیلی ویژن ، انٹرنیٹ، ٹیلی فون ، اخبارات و رسائل اور سماجی رابطے کی ویب سائٹوں نے بہت تیز رفتاری سے ترقی کے مناذل طے کئے۔ اس انقلابی تبدیلیوں نے زندگی کو آسان سے آسان تر بنا دیا۔ اس تیز رفتار رابطوں کی وجہ سے مقامی، ملکی اور بین الاقوامی رابطہ بہت بڑھ گیا ہے۔ سماجی میل جول ، سیاسی تعلقات ، تجارتی لین دین، تعلیمی آمد ورفت کے علاوہ شعبہ صحت کے معملات کے مسائل تک بہ آسانی رسائی حاصل ہوئی ہے۔ غرض ٹیکنالوجی کی اس تیز رفتار ترقی کی وجہ سے دنیا ایک گلوبل ویلج (عالمی گاؤں) بن گیا۔

اسی طرح اگر مواصلاتی نظام کی اس برق رفتاری کے اثرات ادبیات عالم کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب پر بھی دیکھا جائے تو یہ بات عیاں ہے کہ اس نے اردو زبان وادب کو ترقی کی بلندیوں سے ہمکنار کیا ہے۔ اردو زبان جو کہ برصغیر کی پہچان ہے اس ٹیکنالوجی کی سہولیات سے برصغیر کے حدود سے نکل کر دنیا کے دوسرے مما لک میں اپنے جلوے دکھانے میں کامیاب ہوئی ۔ غرض مواصلاتی نظام کے مثبت اثرات سے تو ہر کوئی واقف ہے لیکن اس نظام کا اگر دوسرا پہلو بھی دیکھا جائے تو اردو زبان وادب پر ایسے پیچیدہ اور غور طلب منفی اثرات بھی سامنے آتے ہیں جن کو ابھی تک نظر انداز کیا جاتا ہے۔ موضوع کی نسبت سے چند منفی اثرات کا ذکر پیش ہے۔

زبان دراصل اس بس یا ٹرین کی طرح ہوتی ہے جس پر تھوڑے فاصلے کے بعد مسافر سوار ہوتے یا اُترتے رہتے ہیں یعنی نئے خیالات و افکار یا نظریات ورجحانات ، سیاسی و معاشی تبدیلیاں وضروریات ، تہذیب و تمدن کے علاوہ مختلف ایجادات اور ان کے استعمال سے نئے نئے الفاظ زبان میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح ان مذکورہ تبدیلیوں کے اثرات سے بعض الفاظوں کا استعمال کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو کے نامانوس رہ جاتے ہیں۔ ہماری اردو زبان اس درپیش مسلے کا بہت زیادہ شکار ہو رہی ہے۔ اردو زبان اس قدر نامانوس طریقوں کے نتائج کی زد میں آرہی ہے جس سے نہ صرف اس کا حسن متاثر ہو رہا ہے بلکہ یہ انحطاط اور تنزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔

اگر ہم اپنے ملک ہندوستان کی بات کریں تو ہندی ہماری سرکاری زبان ہے جبکہ بنگالی، گجراتی، تلیگو، مراٹھی، ملیالم، تامل وغیرہ یہاں کی دوسری بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے آئے روز ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد میں کمی آتی رہتی ہے ۔ سال ۲۰۱۱ء کی تازہ مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق اردو زبان ساتویں پوزیشن پر پہنچ گئی ہے۔ جبکہ ۲۰۰۱ء میں اردو چھٹے مقام پر تھی۔ آج پورے ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد صرف 4.34 فی صد ہی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس میں ہماری (اردو والوں) کی بھی کچھ کمزوریاں اور نااہلی ہے۔ اگر ہم اردو کے مواصلاتی نظام میں استعمال ہونے والی زبان کی موجودہ صورتِ کو دیکھ لیں گے تو یہ انتہائی تشویش ناک حد تک بازاری زبان ہو کے رہ گئی ہے ۔ جس میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات سرفہرست ہے۔ آج ریڈیو اور ٹی ۔ وی کی زبان میں ادبیت کا فقدان نظر آتا ہے۔ پرانے زمانے میں کم پڑھے لکھے لوگ ریڈیو کی خبروں سے اپنے تلفظ اور لہجے کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ اب صورتِ حال کافی بدل چکی ہے۔ اب ان زرائع وابلاغ سے نشر ہونے والی زبان کا میعار درمیانے درجے کے پڑھے لکھے فرد سے بھی کم تر ہے۔ انگریزی کے ایسے الفاظ کی بھرمار کی جاتی ہے جن کے اردو میں بہت ہی آسان مترادف الفاظ موجود اور رائج ہوتے ہیں۔ اردو خبر نامہ کے دوران بولنے والے کچھ سوچے سمجھے بغیر زبان کی قینچی ایسے چلا رہے ہیں کہ اختتام تک یہ سمجھ نہیں آتا ہے کہ واقعی یہ اردو خبر نامہ تھا یا انگریزی۔ یہی صورتِ حال ٹیلی ویژن کے اردو پروگراموں کا بھی ہے ۔ یہاں پیش کار کے تلفظ یا زبان کے دوسرے قواعد کے بجائے اس کی اداکاری کو اہمیت دی جاتی ہے۔ پیش کار کے چہرے یا لب ورخسار پر غازہ دیکھائی دینا ضروری ہے ۔ جس کے نتیجے میں وہ پیش کار کے بجائے اداکار زیادہ دیکھائی دیتا ہے ۔ دراصل جب ایسے لوگوں کا تقرری عمل میں لائی جاتی ہے، تو اس وقت ان کو اردو زبان پر مہارت کے بجائے پیشکش پر زیادہ زور دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان بھی بازاری زبان ظاہر ہوتی ہے ۔ دوسری طرف اگر ہم بی۔ بی۔ سی اردو کے نشریات یا پڑوسی ملک پاکستان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اردو نشریات کی بات کریں تو حقیقی معنوں میں ان کی نشریات میں ادبیت اور روانگی پائی جاتی ہے۔

یہی صورت حال اردو اخبارات ورسائل کا ہے۔ غور کیجیے تو محسوس ہوگا کہ اردو والے انگریزی زبان کے الفاظ، اصطلاحات یا محاورے کو یوں قبول کر لیتے ہے جیسے یہ الہامی اور مقدس کلمات ہے ۔ سیکولر میڈیا کی وجہ سے اردو اخبارات میں بڑے بڑے بھاری بھرکم اور اوسط علمی استعداد فرد کے فہم سے بالاتر انگریزی الفاظ بلا تکلف ٹھونسے جا رہے ہیں۔ انگریزی خبروں کے متن کا اردو ترجمہ کرتے وقت مترجم لمحہ بھر سوچنے کی زحمت نہیں کرتا اور آسان الفاظوں کا ترجمہ کر کے مشکل لفظوں کو جوں کا توں چھوڑ دیتا ہے۔ اگر کوئی لکھنے والا کسی مخصوص علاقے یا ملک کے حالات و واقعات کے بارے میں لکھیے تو حسب ضرورت کچھ علاقائی الفاظ یا اصطلاحیں بھی استعمال کرے گا لیکن ایسے الفاظوں کے برمحل استعمال سے اردو زبان کا اپنا حسن ختم ہوتا ہے ۔ مثال کے طور پر اگر کوئی جاپان ، چین یا روس کے مقامی زبانوں کے الفاظوں کا متبادل تلاش کرنے کے بجائے ہو بہو ویسا ہی لکھیے تو یہ اردو زبان کے ساتھ بالکل ناانصافی ہوگی۔ ستم یہ ہے کہ ان غیر ترجمہ شدہ الفاظ کو اردو رسم الخط کے بجائے رواں اردو جملے کے درمیان انگریزی حروف میں ہی لکھا جاتا ہے۔ یہ قباحت

اخبارات ، ٹی ۔وی اور ریڈیو کے اردو نشریات میں زیادہ نظر آتے ہے ۔میڈیا کی کوشش نو جوانوں کی سیاسی اور سماجی بیداری کی طرف لے جانا ہی نہیں ہے بلکہ ان کو ایک ادبی ماحول میں رنگنا ہے ۔آج ادبی اداروں اور انجمنوں کے برعکس میڈیا کا زبان کو تقویت بخشنے میں کافی اہم رول ثابت ہوتا ہے ۔آج خاندان کے افراد ،اڑوس پڑوس یا گلی محلے میں غیر رسمی سماجی میل جول میں کمی کی وجہ سے اب لوگ زیادہ تر نئے ترسیل وابلاغیات سے اپنا زیادہ وقت صرف کرتے ہے ۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ بچے کی زبان ماں کے بجائے زرائع وابلاغ مثلاً ٹیلی ویژن، ریڈیو، انٹرنیٹ ،ویڈیگیم اور کمپیوٹر کے زیر اثر پروان چڑھتی ہے ۔اب نئی نسل کے اکثر بچے اپنی ماں یا گھر کے دوسرے افراد سے کم اور ٹیلی ویژن، ریڈیو اور کمپیوٹر کے زریعے دیکھے جانے فلمی اور کارٹون کرداروں سے زیادہ الفاظ یا کم سے کم ان کی تلفظ اور لب ولہجہ اپنے ذہنوں میں ذخیرہ کرتے ہیں ۔لہذا ابلاغیات کی زبان بالکل سادہ ، سلیس ،رواں اور شگفتگی ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں فنی و ادبی خوبیاں پائی جانی چاہیے اور اسے بیک وقت ایک ہی رسم الخط کی زینت بنانی چاہیے۔

موجودہ دور کو سوشل میڈیا کا دور کہا جاتا ہے انٹرنیٹ کے بڑھتے رجحانات زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا ہے ۔اردو زبان وادب کو بھی انٹرنیٹ کی ویب سائٹوں جیسے فیس بک، واٹس ایپ ،ٹویٹر ،انسٹاگرام اور دیگر سیکڑوں سوشل سائٹس نے ترقی کی بلندیوں سے ہمکنار کیا ہے ۔اردو زبان وادب کی اشاعت میں سوشل میڈیا کے کردار روز روشن کی طرح عیاں ہے ۔آج اردو زبان انٹرنیٹ کی دنیا پر اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو چکی ہے ۔اخبارات ورسائل کتب و دستاویزات، خواہ قانونی ہو یا طبی ، ناول ہو یا افسانہ، تحقیق ہو یا تنقید، نظم ہو یا نثر وغیرہ جو بھی ضروریات ہوں سب کی سب انٹرنیٹ پر دستیاب ہے ۔دوسری جانب اگر اس کے منفی پہلو کو غور سے دیکھیں تو ایسے بے شمار جعلی شعراء وادیب سامنے آتے ہیں جن کا اردو زبان وادب کے ساتھ دور کا بھی کوئی وابستگی نہیں ہوتی ہے اور نا ہی ادبی حلقوں میں ان کا کوئی نام ہے ۔لیکن ایسے لوگ اردو زبان کو آسان سمجھ کر آئے روز اپنے پروفائل پر شاعری یا نثر کے کسی دوسری اصناف پر تحریریں اپ لوڈ کر کے خود کو بڑے علامہ سمجھتے ہے ۔یہ بظاہر ایک معمولی مسلہ نظر آتا ہے لیکن اس سے اردو زبان و ادب کو کافی تقصان ہو رہا ہے ۔کیونکہ ایسے شعراء وادیبوں کے کلام میں جو املا اور ہجوں کی غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں وہ نئی نسل کے نوجوانوں کے ذہنوں پر کافی منفی اثرات برپا کر رہے ہیں ۔نئی نسل کے نوجوان ان کی تحریروں کو اہل زبان کی تحریریں سمجھ کر استفادہ حاصل کر رہے ہے ۔دوسری جانب جو حقیقی معنوں میں اردو ادب کے اہل لسان ہے اور جو نئی نسل

کے نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتے ہے وہ ایسے بے شمار جعلی تخلیق کاروں کی وجہ سے نظر انداز ہو رہے ہیں۔

اردو زبان کا رسم الخط کئی زبانوں کے الفاظ کا ایک خوش نما مرقع ہے ۔اس میں عربی اور فارسی زبان کے حروف پائے جاتے ہیں ۔اسی لیے اردو زبان کے رسم الخط کو خط نستعلیق کہا جاتا ہے ۔ان دو زبانوں کے علاوہ برصغیر کی مقامی بولیوں کے حروف مستعمل ہونے کی وجہ سے اردو رسم الخط کی ایک اپنی الگ انفرادیت اور پہچان ہے ۔اردو زبان کے رسم الخط میں چند حروف ایسے بھی ہے جس کا استعمال کرنے میں کافی نزاکت اور محتاط سے کام لینا پڑتا ہے ۔جیسے ”ہ اور ھ“، ”ڈ اور ڑ“، ”ز اور ذ“، ”ی اور ے“ وغیرہ ۔جدید دور میں کمپیوٹر کے بڑھتے رجحان کی وجہ سے ان پیج کے زریعے لکھنے کا رواج کافی عام ہوا ہے ۔یہ اردو زبان کی ترویج کے لیے ایک خوش آئین بات ہے ۔لیکن کمپیوٹر کے تخت حروف (Key Board) پر انگلیاں چلانے والے جب دھڑا دھڑ اردو رسم الخط میں تحریریں لکھتے ہیں تو مذکورہ حروف تہجی کے صحیح استعمال کرنے میں غلطیاں کر جاتے ہیں ۔مثال کے طور پر ”ہ“ ہائے ہوز اور ”ھ“ ہائے دوچشمی کو لکھتے وقت اکثر املا کی غلطیاں ہوتی رہتی ہے ۔جیسے بھاری سے بہاری، پہاڑ سے پھاڑ، دہرا سے دھرا، تھالی سے تہالی، کھرا سے کہرا وغیرہ ۔اسی طرح روڑ، توڑ، موڑ، ڈول، ڈکٹیٹر، ڈسنا اور ڈاک جیسے الفاظوں میں ڑ اور ڈ لکھتے وقت املا کی غلطیاں درپیش آتی ہے ۔اس کے علاوہ اردو زبان میں مستعمل مرکب حروف جیسے بھ پھ جھ لھ نھ وغیرہ کے صحیح استعمال کرنے میں کمپیوٹر کے تخت حروف کے زریعے املا کی غلطیاں ہوتی ہے ۔یہ اس لیے ہوتا ہے کیونکہ بعض لوگ جن کو اردو زبان کے رسم الخط کے بارے میں شناسائی نہیں ہوتی ہے ۔وہ ”ہ“ اور ”ھ“ کو ایک دوسرے کا متبادل یا مترادف تصور کرتے ہے ۔اسی طرح مرکب حروف کو اردو رسم الخط میں غیر ضروری سمجھتے ہیں ۔حالانکہ مرکب حروف کے بغیر اردو زبان کا وجود ہی ناممکن ہے۔

کافی چھان بین کے بعد جو الفاظ میں نے غلط ہجوں اور شکلوں میں پائے ہیں ذیل میں چند مثالیں پیش کر رہا ہوں:

غلط الفاظ	صحیح الفاظ
اژدہام	ازدحام
حامی بھرنا	ہامی بھرنا
مواقوں	مواقع یا موقعوں
منگل وار کے دن	منگل کے دن
یہ بات واضع کرو	یہ حساب واضح کرو
حساب بے باک کرو	حساب بے باق کرو
رقیق	رکیک
سیب کا مربع	سیب کا مربّہ
نکتہ نظر	نقطہ نظر
اہم نقطہ	اہم نکتہ
اعلا	اعلیٰ
بلکل	بالکل
گذارش	گزارش
مسالہ	مصالحہ
کاغز	کاغذ
نذر	نظر
بین القوامی	بین الاقوامی

اس کے علاوہ جملوں میں تذکیر و تانیث یعنی مذکر و مونث کی غلطیاں بھی بہت عام ہیں ۔ذیل میں چند مثالیں پیش ہیں:

غلط جملے	صحیح جملے
ایسا موقعہ پھر نہیں ملے گا	ایسا موقع پھر نہیں ملے گا

آپ کا مذاج کیسا ہے؟	آپ کے مزاج کیسے ہیں؟
ہجوم نعرے لگا رہے ہیں	ہجوم نعرے لگا رہا ہیں
آج کی اخبار آ گئی	آج کا اخبار آ گیا
عوام جمہوریت چاہتی ہے	عوام جمہوریت چاہتے ہے
اس لفظ کی معنی کیا ہے؟	اس لفظ کے معنی کیا ہے؟
آپ کیا کہتے ہو؟	آپ کیا کہتے ہیں؟
مذید کیا کہتے ہیں	مزید کیا کہتے ہیں
ساری چیزیں اکھٹی کرلو	ساری چیزیں اکٹھی کرلو
انھوں نے کہا کے	انھوں نے کہا کہ
میں نے کہا تھا نہ کہ مت جانا	میں نے کہا تھا نا کہ مت جانا
دو کان سے سامان لے آؤ	دکان سے سامان لے آؤ
قیمتیں دن بدن بڑھ رہی ہیں	قیمتیں روز بروز بڑھ رہی ہیں

اہل علم خصوصاً ترسیل وابلاغیات (ریڈیو، ٹی۔وی، اخبارات ورسائل) اور سوشل میڈیا سے وابستہ لوگوں سے میری گزارش ہے کہ ان معروضات پر سنجیدگی سے غور کریں اور اردو املا کے نظام میں موجود ایک بہت بڑے علمی سقم اور مغالطے سے نکلنے کی کوشش کریں۔ یادرکھے! دنیا کو کوئی ضرورت نہیں کہ ہماری زبان کو سنبھال کرر کھے۔ یہ زمہ داری ہمیں خود اُٹھانی ہے، مجھے اردو زبان پیاری ہے تو مجھے اپنا پیار خود ہی ثابت کرنا ہے۔ وحشت صاحب نے اس بارے میں خوب کہا ہے۔

کس طرح حسن زبان کی ہو ترقی وحشتؔ
میں اگر خدمت اردوئے معلیٰ نہ کروں

لہذا یہ سب اہل اردو زبان لوگوں پر فرض ہے کہ وہ نجی اور اجتمائی سطح پر اس زبان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے اقدامات اُٹھائیں اور تمام ادبی اداروں اور انجمنوں کی زمہ داری بنتی ہے کہ وہ اردو زبان کے درپیش مسائل دور کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ تاکہ ہماری اس پیاری، خوبصورت اور دلکش زبان کو کسی بھی صورت میں بازاری زبان نہ بنادیں۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

''اردو کو لیڈروں کی نہیں مخلص کارکنوں کی ضرورت ہے۔''

●●

واجدہ تبسم کا بے باک ناول :نتھ کی عزت

فیاض حمید

ریسرچ اسکالر شعبہ اردو وفارسی ڈاکٹر ہری سنگھ گور سینٹرل یونیورسٹی ساگر ایم پی

''نتھ کی عزت'' واجدہ تبسم کا ناول ہے جو ۱۹۸۳ء میں شایع ہوا۔ جو اردو ناول کی دنیا میں ایک بے باک ناول نگار کی حیثیت سے مانی جاتی ہیں۔ ان کے بیشتر ناول روایات سے بغاوت کے حامل ہیں جو کہ ایک مخصوص تہذیبی اور معاشرتی پس منظر میں لکھے گئے ہیں، تاہم موضوعات اور زبان وبیان کے اعتبار سے خواتین اردو ادب میں ایک منفرد اور بے باک رجحان کا اعلان کرتے ہوئے منظر عام پر آئے۔ ان کی تحریروں میں سماجی اور معاشی دباؤ میں کچلی ہوئی عورتوں کی نفسیات، ذہنی رجحانات اور ذاتی ردعمل کی مکمل عکاسی نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے نالوں میں خصوصیات کے ساتھ حیدر آباد کے رواحتی ماحول اور معاشرے میں عورت کا استحصال پر کھل کر نشتر زنی کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ واجد تبسم کی بے باکی بھی کبھی کبھی اعتدال کی حد کو پار کر جاتی ہے لیکن اکثر وبیشتر وہ حقیقت پسندی اور حق بیانی ہی سے کام لیتی ہیں۔ دراصل واجدہ تبسم نے جاگیردارانہ ماحول میں پرورش پائی اسی لئے ان کے ناولوں میں جاگیردارانہ تمدن اور معاشرت کے ساتھ ساتھ جنس کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ خواتین میں جنسی میلانات کے آزادانہ اظہار نے عصمت چغتائی کی طرح واجدہ تبسم کو بھی خصوصی شہرت دی، انہوں نے اس کو اُس وقت موضوع بنایا جب یہ قابل ملامت مانا جاتا تھا اور خاص کر عورت کے قلم سے نکلنے والے اس موضوع نے ادبی دنیا کو جھنجوڑ کر رکھ دیا مگر وہ مسلسلہ لکھتی رہیں۔ وہ اپنے موضوعات کے بارے میں یوں لکھتی ہیں؛

''میں نے اپنے قلم کے ذریعہ ہمیشہ مظلوم طبقے کا ساتھ دیا ہے میرا توجہ کا مستحق ہمیشہ کچلا اور پسا ہوا نچلا طبقہ رہا ہے، وہی نچلا طبقہ جو دراصل سب سے زیادہ اہم ہوتا ہے، کسی بھی بلندی پر چڑھنے کے لئے سب سے پہلا قدم سب سے نچلی سیڑھی پر رکھا جاتا ہے میں اس نچلی سیڑھی کی اہمیت جانتی اور مانتی ہوں اور میری ساری ہمدردری ان آنکھوں کے ساتھ ہوتی ہے جو آنسوں سے بھری ہوتی ہے۔''[۱]

''نتھ کی عزت ا'' ور'' کیسے کاٹون رین اندھیرے'' ان کے مشہور ناول ہے۔ جن میں انہوں نے حیدر آباد دکن کی خاص مسلم تہذیب کے پس منظر میں یادگار ناول تخلیق کیے ہیں۔ ان کا مرکزی موضوع طوائف ہے۔ حیدر آبادی معاشرت میں طوائف کا کردار اور اسکی زندگی کے نشیب وفراز، اس کی خوشیاں ان کے غم، ان کی خواہشیں، اس کی حرکت اور گھریلو زندگی پر اس کے اثرات کا تجزیہ وہ فنی خوبی کے ساتھ کرتی ہیں۔ ''نتھ کی عزت'' بھی ایک طوائف اور اس کی بیٹی کی کہانی پر مبنی ناول ہے۔ یہ اُس دور کا ناول ہے جب طوائفوں کی بحالی کا مسئلہ درپیش تھا اور ان کو اس پیشے سے ہٹا کر انھیں سماج کے مرکزی دھارے میں لانا، سماج میں انھیں مقام دلانا، انھیں خود مختار بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن سماج انھیں کسی طرح برداشت نہیں کرتا۔ ڈاکٹر نیلم فرزانہ ان کے ناولوں کے بارے میں یوں لکھتی ہیں:

'' واجدہ تبسم نے حیدر آباد کے نوابوں اور طوائفوں کی بے شمار کہانیاں بیان کی ہیں۔ یہ واجدہ تبسم کا مخصوص اور محبوب موضوع ہے۔ انھوں نے بیشتر ناولوں اور افسانوں میں نوابوں کی عیاشیاں، ان کی طوائف بازیاں اور ان محلوں میں عورتوں پر

phdfayaz@gmail.com

ہونے والے مظالم کی داستان پیش کی ہے۔اس ایک موضوع کی ان کے یہاں اس قدر تکرار ہے کہ اب واجدہ تبسم کے نام سے ہی حیدرآباد کے نوابوں اور ان محلوں کی کہانیاں ذہن کے پردوں پر ابھر آتی ہیں۔اصل میں واجدہ تبسم کا بنیادی مقصد اس تہذیب وشائستگی کے پس پردہ ہونے والی اس طبقے کی عیاشیوں کو پیش کرنا ہے۔''[2]

''نتھ کی عزت'' ناول مصنفہ نے نواب شوکت یار کی شادی کو لے کر شروع کی ہے جو حیدرآباد کے نوبواں کا عظیم شان اور نامور خاندان کا اکلوتا وارث ہوتا ہے۔اور وہ اپنی شادی میں ناچنے اور گانے کے لئے ایسی طوائفوں کو ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے جو سب سے الگ ہو کیونکہ پورے حیدرآباد کی نظریں ان کی شادی پہ ہی مرکوز ہے کیونکہ وہ سوچتا ہے کہ ہر اعلیٰ سے اعلیٰ انتظام کے باجود ناچ رنگ اور مجرے کا بھی اپنا معیار ہوتا ہے۔اس سلسلے شہر میں ایک سے ایک طرح دار طوائف جو گانے میں بھی اپنی مثال اور ناچنے میں بھی اپنی مثال آپ ہوتی آتی رہی، بلاتی جاتی رہی اور دھتکاری رہی۔وہ اسی خوب سے خوب تر کی تلاش میں آئے دن محفلیں سجا رہتا ہے اور اس کا انتظار اُس وقت ختم ہوتا ہے جب ایک نسبتاً گم نام اور کم معروف گانے والی زمانی بیگم اور ان کی بیٹی حیا سے واسطہ پڑتا ہے اور اس کو پہلے بار میں ہی زمانی بیگم کی بیٹی سے محبت ہو جاتا ہے۔اور اس کو دل ہی دل میں چاہنے لگتا ہے۔اور دل میں سوچتا ہے کہ لڑکیاں اتنی حسین بھی ہو سکتی ہیں کیا۔اس کے بعد وہ ہر روز طوئف کے کوٹھوں پر جانے لگتا ہے جہاں پر بہت سی لڑکیاں ہوتی ہے وہ سب کو چھوڑ کا حیا میں دلچسپی لیتا ہے اور حیا جو اب تک مردذات کی ہوس کا شکار نہیں ہوئی تھی جس کا نتھ ابھی تک برقرار تھا اس کے سامنے پیار محبت کا ڈھونگ رچا کر اُس کو سماج میں نوابوں کی دولہن بنانے کا وعدہ دے کر اُس معصوم کو ہوس کا شکار بناتا ہے اور پھر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔یہاں تک کہ یہ پیٹ سے ہوتی ہے لیکن وہ اس کا پروہ کیا بناء اپنی برادری میں ہی شادی کرتا ہے۔اور پھر یہاں تک کہتا ہے کہ ابھی تک کبھی ایسا نہیں ہوا ہے کہ طوائف اس گھر میں دولہن بن کر آیئے۔وہ حیا اور اس کی ماں کو پیسے دیتا جس سے زمانی بیگم خوش تو ہوتی ہے لیکن حیا اس کو برداشت نہیں کر پاتی۔زمانی بیگم اگرچہ بچہ گھرانے کی بھی بات کرتی ہے لیکن حیا اپنی ماں سے فریاد کر کے کہتی ہے کہ نہیں یہ میرے پہلے اور آخری پیار کی نشانی ہے۔

اس طرح حیا، بیٹی کو جنم دینے کے بعد بھاگ جاتی ہے اسی غم میں اس کی ماں مر جاتی ہیں اور ان کا کوٹھا سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔اور دوسری طرف شوکت محل میں ''نواب شوکت'' کے یہاں ایک لڑکا اور پانچ بیٹیاں پیدا ہوتی ہے چونکہ بیٹے کی پرورش بڑے ناز سے ہوتی ہے اور شوکت محل میں مردوں کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔لہذا اس کی پرورش پر نسوانیت کا اثر حامل ہو جاتا ہے۔لہذا ڈاکٹروں کے مطابق اس کی پرورش کئی دور کسی اور ماحول میں کرنے کی صلاح دی جاتی ہیں۔اس طرح نواب کی فکر اُس وقت دور ہوتی نظر آتی ہیں جب وہ اپنے بیٹے کو طوائف کے گھر میں ذاکر صاحب کے کہنے پر رکھنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔اور کچھ مدت کے بعد نہ صرف اُس کی نسوانیت کے اثرات ختم ہو جاتے ہے بلکہ وہ طوائف ''توبہ'' کے ساتھ شادی کرنے کی ضد کرتا ہے۔اور آخر اکلوتے جوان بیٹے کی ضد کے آگے باپ کی کچھ نہ چلی۔اخر بڑے دھوم دھام سے ان کی شادی کی جاتی ہے پورا حیدرآباد سنبھالہ جاتا ہے آخر نواب شوکت یار جنگ کے اکلوتے بیٹے کی دولہن کا چڑھاوا تھا۔لیکن دولہن جب سسر کے سامنے گھونگٹ اٹھاتی ہے تو اس کی زبان سے حیا نام نکلتا ہے۔ جو نواب شوکت سے اس کے اکلوتے بیٹے سرفراز کے ذریعہ انتقام لیتی ہے اور پرانے رسم ورواج کو توڑ کر نوابوں کی محفل میں دولہن بن کر آتی ہے۔اور آخر نواب کے سامنے یہ کہہ کر خودکشی کرتی ہے کہ میری پہلی اور آخری محبت آپ ہی تھے۔

ناول کا مرکزی کردار حیا ہے جو ایک طوائف کی بیٹی ہے۔طوائف کے گھر جنم لینے والی ان بیٹیوں کی نمائندہ بن کر ابھرتی ہے جو شریف گھرانوں کی عزت مند لڑکیوں کی مانند بیاہے جانے کی خواہش رکھتی ہیں۔صرف ایک مرد کا ہاتھ ان کی آرزو ہوتا ہے۔جسم فروشی کے بجائے گرہستن کی زندگی انہیں پسند ہوتی ہے۔لیکن سماج ان کی اس معصوم آرزو کو اپنے ظالم پیروں تلے روندنے سے باز نہیں آتا۔اس کی ماں اسے بھی طوائف پیشے سے ہی منسلک کرنا چاہتی ہے لیکن اس کے اپنے ادرش اصول ہے۔لیکن اس کی ماں اس سے بار بار کہتی ہے کہ؛

''اری حرام زادی۔۔تو حرافہ تیری ماں حرافہ۔۔شریف زادی بننا ہے تو پڑھوا لے کسی سے دو بول۔۔جب سال پیچھے بچہ پیدا کروائے گا، اور جوتوں لاتوں سے تواضع کرے گا پھر آ کر مجھ سے بات کرنا۔حرام زادی کے مزاج ہی نہیں ملتے۔جب گانا سیکھنے کو بٹھاؤ، اُلٹے سیدھے بول اور تان نکالے گی۔ناچنے کو کھڑا کرو جان جان کر بےتال ہونے لگی گی۔تیری سات پشتوں میں بھی کسی نے گھرداری اور ہانڈی ڈوئی کی ہے۔۔۔یہ ایک بڑی پردہ دار بی بی بنے چلی ہے۔''[3]

ایک اور جگہ حیا سے کہتی ہے کہ؛

''یہ رنڈی زادی ہو کر بھی سات پردوں میں چھپی بو بو بن کر رہنا چاہتی ہے۔کیا حسن پایا ہے کم بخت نے اور کیا جسم دیا ہے اس کو مالک نے۔کیا آنکھیں دی ہیں رب کریم نے اور نگاہوں کا انداز؟ نیلی ناگن کے کاٹے کا منتر مل جائے۔مگر اس کے ایک انداز نظر کا مول نہ ملے۔لیکن کم بخت نامراد۔نہ سنگھار کرے۔نہ کپڑے لتے میں دلچسپی لے۔زیور سے نگوڑی کو باپ مارے کا بیر ہے۔ذرا پہنا اوڑھا دوں تو میری نظر لگنے لگتی ہے، مردوں کا تو کیا حال ہو جائے۔لیکن نامراد کو مذہب کی تعلیم اور ترجمے سے قران شریف پڑھانا ہی جرم ہو گیا۔۔[4]

حیا کی تربیت میں بچپن سے ہی مولوی صاحب کا ہاتھ ہے جن سے تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ حیا قران شریف پڑھتی ہے اور پردہ میں رہنے کو ترجی دیتی ہے ۔لیکن وہ جس ماحول میں رہتی ہے وہاں دور دور تک پردے کا نام ونشان نہیں ملتا۔لیکن وہ اس ماحول سے بغاوت کرتی ہے اور اپنے ماں کے پیشہ کو ناپسند کرتی ہے بلکہ گھر چھوڑ کر ''توبہ'' کا روپ دھار لیتی ہے۔اس سے پہلے ہی نواب کے جھوٹے وعدے میں پھنس کر خود اپنی عصمت لوٹاتی ہے اور بناء باپ کے بچہ کو بھی جنم دے کر تن تنہا زمانے سے مقابلہ کرنے نکلتی ہے اس طرح نواب سے قصاص کے خاطر حیا سے 'توبہ' بارہ سال تک مسلسل جدوجہد اور منصوبہ بندی کرتی ہے اور آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتی ہے۔وہ نواب کے بیٹے سرفراز کی دولہن بن جاتی ہے لیکن خودکشی کر کے ٹھکرا دیتی ہے کیونکہ اس کے والد کو اپنی پہلی اور آخری محبت مانتی ہیں۔

ناول کا دوسرا کردار ''نواب شوکت جنگ'' کا ہے جو حیدرآباد کے اعلیٰ نوابوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور بہلا پھسلا کر عورتوں کے جذبات کے ساتھ کھیلتا ہے اور ان بےچاریوں کو شادی کا وعدہ دے کر ان کی آبرو لوٹ لیتا ہے۔حیا بےچاری کے ساتھ بھی یوں ہی ہوا۔جس کو پہلے پہل نواب شوکت نے بیاہ

اور محلوں کے خواب دکھائیے۔اور بعد میں اُس کو ٹھکرا کر شادی کئی اور کرلی۔ پہلے پہل تو وہ اکثر حیا اور اس کی ماں سے کہتا رہتا تھا کہ؛

''اپنے محل کے بڑے بھی ہمی ہیں ۔چھوٹے بھی ہمی ۔۔ہم اگر تم کو اپنا لئے تو ہمیں کون منع کرنے چلے۔۳۰۔حیا ہم تو باقاعدہ آپ سے شادی کریں گے۔۔ ہم آپ کو بیاہ کرلے جائیں گے اور وعدہ کرتے ہیں کہ سدا آپ کو ڈھانک کر رکھیں گے۔۔۔''۵

نتھ کی عزت: واجدہ تبسم؛ شمع بک ڈپوئی دہلی: اکتوبر۱۹۸۳؛ص؛۳۸۔۳۷۔۳۰۔

نواب شوکت کا دل جب حیا سے بھر گیا تو اُس نے نہ صرف حیا بلکہ اس کے گود میں پل رہی بچی کو بھی اپنانے سے انکار کرتا ہے۔یہاں تک کہ جب حیا بیٹی کی خبر اُس سے محل میں دینے گئی تو وہ چونک جاتا ہے اور اُس کا رویہ یک دم بدل جاتا ہے کہ؛

''دیکھے حیا بیگم۔۔۔ہمارا خاندان نوابوں کا کتنا عظیم الشان اور نامور خاندان ہے۔۔۔ہم یہ نئیں بولتے کہ ہمارے خاندان میں کوئی رنڈی بازی نہیں کرایا ،ناچ گانے سے شوخ نئیں فرمایا۔ پر یہ کبھی نئیں ہوا کہ کسی طوائف کو گھر ڈال لیا ہو۔آخر نام ونمود اور خاندانی شرافت بھی ایک چیز ہے۔۔۶۔۔

لیکن اس کے برعکس حیا اپنی گود میں پلی بچی کے لئے اس سے یہ جواب دیتی ہے کہ میں اس کو زندگی کی سب سے بڑی خوشی سمجھتی ہوں۔مرد ہمیشہ اسے مذاق ہی سمجھتا ہے۔اس لئے کہ سہرے تورے کے لوازمات اور نکاح کے چند مقدس بول اس عورت اس بازاری عورت کا مقدر نہیں ہوتے جس قبیل سے میں تعلق رکھتی ہوں۔اور نواب شوکت چاندنی اور سونے سے حیا کا منہ بند کرنا چاہتا ہے۔لیکن دراصل وہ محبت کی پیاسی ہے نہ کہ دولت کی۔اسلئے آخر تک وہ انتقام کے موڑ میں نظر آتی ہیں۔مصنفہ نواب شوکت کے بارے میں یوں لکھتی ہیں؛

''تو نواب شوکت اتنے دنوں کنوارے رہے تھے، یونہی نہیں رہے تھے، ایکو ایک کلی سونگھی، ایکو ایک کچا، پکا، ادھ پکا پھل چکھا اور جب خوب مزے باغ زندگی کے لوٹ لئے تو چلو ماں کو خوش کرنے اور نسل چلانے شادی بھی کرہی لو۔۷

''زمانی بیگم'' نتھ کی عزت'' کا دوسرا بڑا کردار ہے۔جو اُس زمانے کے حیدرآباد میں طوائف سے متعلق تہذیبی ادارے کی ایک مکمل تصویر ہے۔روپے پیسے کی حریض، اس حد تک کہ اکلوتی بیٹی کو بھی دولت پر قربان کردینے والی نظر آتی ہے۔اور اپنی بیٹی کے بارے میں سوچتی ہے کہ؛

''کیا ہی اچھا ہو کہ نواب صاحب بیٹا کو بھلے بیاہ کر ہی سہی، لے تو جائیں لیکن چند روز بعد دل سے اُتر جائے تو یہی پھینک جائیں۔یہ پچاس ہزار تو مل ہی گئے۔پھر تو جب تک بیٹا کی جوانی ہے۔راتیں آباد ہیں، تجوری سُہاگن کی طرح لدی پھندی ہے۔اے اللہ ایسا ہی ہو۔نواب صاحب کے دل سے بیٹا اُتر جائے۔شادی کرکے لے بھی جائیں گے تو برابری کا درجہ تو دیں گے نہیں۔اے لاکھ گدھے کو گھوڑوں کے اصطبل میں باندھ دو، رہے گا تو وہ گدھا ہی۔۔اس نامراد کو محل کی خاندانی بیبیوں میں لے جا کر بٹھال بھی دیں گے تو رہے گی وہ بازاری اور طوائف زادی ہی۔''۸

لیکن یہی کردار آخر کار بیٹی کی جدائی کے چکر میں پاگل ہو جاتی ہے اور حیا کے چلے جانے کے بعد خود ٹوٹ کر رہ جاتی ہے۔اُس کا سب کچھ بکھر جاتا ہے۔اور وہ اپنے پیشہ کی مجبوریوں کو بالا طاق رکھتی ہوئی نظر آتی ہے اور اپنی بیٹی کے متعلق یوں سوچتی ہیں؛

''نواب کو ساری ڈھیل میں نے دی۔۔حیا کو بنا سنوار کر، اس کے پاس تنہائی میں نواب کو بیجھا۔۔جوان لڑکی۔۔خوب صورتی ،تنہائی اور قدرتی شرم۔سارے چیزوں نے مل کر نواب کو پاگل کردیا اور وہ دل سے گذر گیا۔۔لوگ کوٹھوں پر نماز پڑھنے نہیں آتے۔۔وہی کرنے آتے ہیں جو نواب نے کیا۔لیکن میں چاہتی تو عین نکاح والے دن بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر نواسی کو گود میں دے کر سارے حیدرآباد کے سامنے ناک نیچی کرواسکتی تھی۔لیکن یہاں بھی میری ہی خود غرضی کام آئی۔۔میں نے سوچا گھر کی آمدنی گھر ہی میں رہے گی۔۔ٹالتی گئی۔۹

اسی غم میں ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔اس کے علاوہ سرفراز کے کردار میں بھی نوابوں کے طبقے کا یہی ہوس پرستی نظر آتی۔جب وہ نوکر کی بیٹی کو اپنی ہوس کا شکار بناتا ہے تو ماتم کے بدلے'' شوکت محل'' میں خوشی منائی جاتی ہے کہ بیٹا جوان ہو گیا۔اور اس لڑکی کے ماں باپ جن کا بُرا حال ہے کسی کو فکر نہیں۔

مجموعی طور پر واجدہ تبسم کا یہ ناول ایک طوائف کے محبت بھرے دل کی داستان ہے۔جسمیں ایک طوائف مکمل روایت سے بغاوت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔وہ دولت کو ٹھکرا کر بیاہ کے وعدے پر اپنا سب لٹانے کو تیار ہو جاتی ہے لیکن جب اُس کو فریب کے سوا کچھ نہیں ملتا تو وہ بڑی ہمت کے ساتھ مقابلہ کرکے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتی ہے۔اور اس طرح پرانی روایت کو توڑ کر اسی محل میں دولہن بن کر اپنے محبت کا انتقام لیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

حوالہ جات؛

۱۔اترن؛ واجدہ تبسم؛ اور سیز بک سنٹر بمبئ ۵۸؛ طبع اول: ۱۹۷۷؛ص ۱۷۔

۲۔اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار؛ نیلم فرزانہ؛ براؤن بک پبلی کیشنز نئ دہلی؛ اشاعت؛ ۲۰۱۴؛ص ۳۴۰۔۳۳۹۔

۳۔ نتھ کی عزت: واجدہ تبسم؛ شمع بک ڈپوئی دہلی: اکتوبر۱۹۸۳؛ص؛۱۶۔

۴۔نتھ کی عزت: واجدہ تبسم؛ شمع بک ڈپوئی دہلی: اکتوبر۱۹۸۳؛ص؛۳۲۔

۵۔نتھ کی عزت: واجدہ تبسم؛ ایضا ۱۹۸۳؛ص: ۳۸۔۳۷۔۳۰۔

۶۔نتھ کی عزت: واجدہ تبسم؛ شمع بک ڈپوئی دہلی: اکتوبر۱۹۸۳؛ص: ۵۸۔۵۷۔

۷۔نتھ کی عزت: واجدہ تبسم؛ شمع بک ڈپوئی دہلی: اکتوبر۱۹۸۳؛ص: ۸۵۔

۸،نتھ کی عزت: واجدہ تبسم؛ شمع بک ڈپوئی دہلی: اکتوبر۱۹۸۳؛ص: ۴۲۔۴۳۔

۹۔نتھ کی عزت: واجدہ تبسم؛ شمع بک ڈپوئی دہلی: اکتوبر۱۹۸۳؛ص: ۷۴۔۷۳۔

●●

معذور افراد کو اپنی مثبت سوچ سے منزل کی جانب گامزن ہونا چاہیے: ڈاکٹر شاہد اختر

وزیر اعظم نریندر مودی نے معذوروں کو با اختیار بنانے کے لیے اہم اقدامات کیے ہیں: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

عالمی کتاب میلہ میں قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 'شمولیت: با اختیار بنانے کی جانب پہلا قدم' کے موضوع پر مذاکرے کا انعقاد

نئی دہلی۔ عالمی کتاب میلہ 2019 کی تھیم معذوروں سے متعلق رکھی گئی ہے۔ اس تھیم کے انتخاب سے معذوروں کے تئیں حکومت ہند کا نیک جذبہ اجاگر ہوتا ہے۔ حکومتی سطح پر ملک کے اندر عزت مآب جناب نریندر مودی جی نے معذوروں کو با اختیار بنانے کے لیے کئی اہم اقدامات کیے ہیں جو قابل تعریف ہیں۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے عالمی کتاب میلہ میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام منعقدہ مذاکرہ بہ عنوان 'شمولیت : با اختیار بنانے کی جانب پہلا قدم' میں استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان معذوروں کے تعلق سے معاشرے اور سماج کو اپنی سوچ اور نظریے میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ جسمانی طور پر معذور ہونے کے باوجود اگر کوئی ذہنی طور پر صحت مند ہے تو ہم اسے معذور نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس میں کچھ کر دکھانے کا جذبہ ہوتا ہے۔ انھوں نے اسٹیفن ہاکنگ کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ جسمانی طور پر معذور ہونے کے باوجود انھوں نے اپنی سوچ وفکر سے دنیا کے سامنے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جو ان کے نام کو رہتی دنیا تک قائم رکھیں گے۔ اس لیے ہمیں معذوروں کے تئیں مساوی جذبہ رکھنے کی ضرورت ہے اور انھیں سماج کے مین اسٹریم میں لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مزید کہا کہ کونسل برایل رسم الخط میں اردو سکھانے کی ایک کتاب شائع کرے گی تاکہ نابینا حضرات بھی اردو سیکھ سکیں۔

اس موقع پر قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین اور اس پروگرام کے مہمان خصوصی ڈاکٹر شاہد اختر نے بھی پر مغز گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ معذوروں کو لوگوں کی سوچ اور ان کے برتاؤ پر دھیان دینے کے بجائے اپنے قدموں پر کھڑے ہو کر منزل کی طرف گامزن ہونا چاہیے۔ دنیا ایسے ہی لوگوں کو عزت و وقار کی نظر سے دیکھتی ہے جن میں کچھ کر دکھانے کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ انھوں نے معذوروں کے تئیں معاشرے میں اخلاقی تعلیمات کو عام کرنے پر زور دیا ساتھ ہی ایسے لوگوں کی خدمات پر اردو میں ایک کتاب شائع کرنے کا مشورہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ خصوصی ضروریات کے حامل لوگ تاریخ بدلنے کا حوصلہ رکھتے ہیں اور مثالیں موجود ہیں کہ ایسے لوگ کامیابی کی بلندیوں پر پہنچے ہیں۔

مذاکرے میں شریک فیض اللہ خان نے کہا کہ معذورں کے تئیں اختیار اور حقوق کی بات تبھی کارگر ہوگی جب ہم اپنی سوچ وفکر میں مثبت تبدیلی لائیں گے۔ ڈاکٹر اصغر علی نے کہا کہ ایسے اہم موضوع پر مذاکرہ کرانا ہی معاشرے کی مثبت سوچ کو اجاگر کرتا ہے۔ ہمیں اس موضوع پر اور غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

اس موقع پر سور بھ رائے نے کہا کہ حکومتی سطح پر معذوروں کے لیے قانون کا نافذ ہونا تو ٹھیک ہے لیکن اس سے بڑھ کر ہماری ذمے داری بنتی ہے کہ ہم ان کے تعلق سے کیسا رویہ رکھتے ہیں۔ پروفیسر نصر شکیل رومی نے کہا کہ ہمیں اپنے آپ کو معذور تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے اندر صحت مند لوگوں کے مدمقابل کچھ کر دکھانے کا جذبہ ہونا چاہیے۔ ہمیں حکومت اور دوسرے فلاحی اداروں پر انحصار نہیں کرنا چاہیے بلکہ ہمیں خود کو تیار کرنا ہے اور اپنی خود اعتمادی سے دنیا کو بتانا ہے کہ ہم معذور نہیں ہیں۔ اس پروگرام میں کونسل سے شائع شدہ تین کتابوں کا اجرا بھی کیا گیا۔ قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی نے سبھی مہمانوں کا تعارف پیش کیا اور اس پروگرام کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیے۔ ڈاکٹر عبدالحی نے سبھی شرکاء کا شکریہ ادا کیا۔ نیشنل بک ٹرسٹ کے مین ایڈیٹر ڈاکٹر شمس اقبال نے این بی ٹی کی جانب سے بھی شکریہ ادا کیا اور سبھی مہمانوں کو نئے سال کا کلینڈر بھی تحفے میں پیش کیا۔ پروگرام کو کامیاب بنانے میں ڈاکٹر شمس اقبال اور این بی ٹی کے دیگر اسٹاف کا اہم رول رہا۔

(رابطہ عامہ سیل)

اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے نئی نسل کی حوصلہ افزائی ضروری: ڈاکٹر سید تقی عابدی

اردو میں دیگر مذاہب کی تصنیفات کے حوالے سے ایک قومی سمینار کا انعقاد کیا جائے گا: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

یومِ ثقافتی اتحاد کے موقعے پر قومی اردو کونسل میں خطبے کا اہتمام

نئی دہلی: اردو گنگا جمنی تہذیب کا وہ گلدستہ ہے جس میں رنگ رنگ کے پھول ہیں۔ اردو بتدریج پنپ رہی ہے۔ اردو کی نئی بستیاں پچھلے سو سال سے اردو کے لیے کام کر رہی ہیں۔ ان خیالات کا اظہار کناڈا سے تشریف لائے معروف محقق و ادیب ڈاکٹر سید تقی عابدی نے یوم ثقافتی اتحاد کے موقع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مرکزی ہال میں 'اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے تحفظ اور ترقی کے مسائل و وسائل کا جائزہ' کے عنوان سے خطبہ پیش کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ دنیا بھر میں اردو کی بہت سی بستیاں ہیں جہاں اردو کے چاہنے اور بولنے والے خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ ٹورنٹو میں ساڑھے تین سے چار لاکھ افراد اردو سمجھتے ہیں۔ اسی طرح امریکہ، کناڈا، یورپ، آسٹریلیا اور مشرق وسطیٰ میں بھی بہت سے لوگ اردو سے جڑے ہوئے ہیں اور ان میں اردو کے لیے بھرپور جوش و ولولہ ہے، البتہ تجربہ اور رہنمائی کی کمی ہے۔ اگر انھیں رہنمائی اور سرپرستی حاصل ہو تو ان بستیوں میں اردو کی صورتِ حال اور بہتر ہو سکتی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ سے لے کر آج تک اردو کے شعرا و ادبا گنگا جمنی تہذیب کو فروغ دیتے رہے ہیں۔ حیدرآباد میں محمد قلی قطب شاہ کے مزار سے مشترکہ تہذیب کی عکاسی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی نے اپنے خطاب کے دوران کہا کہ نوجوانوں پر خاص توجہ دی جانی چاہیے، ان کی کتابوں اور تخلیقات کو شائع کر کے ان کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ تاکہ اردو کی مضبوط نئی نسل تیار ہو سکے۔ انھوں نے اردو کو نئی ٹیکنالوجی سے جوڑنے پر بھی زور دیا تاکہ اردو کے مسائل کے تدارک اور اس کے فروغ کے لیے جدید تناظر میں موثر وسائل و ذرائع تلاش کیے جا سکیں۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے اردو میں قاری کے بحران پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو میں قارئین کی تعداد کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے۔ ریڈرشپ کو بڑھانے کے لیے اہم اقدامات کیے جانے کی ضرورت ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے لیے مسرت و فخر کی بات ہے کہ اس وقت ہمارے درمیان اردو دنیا کی معروف اور ممتاز شخصیت ڈاکٹر تقی عابدی موجود ہیں۔ وہ کناڈا میں قیام پذیر ہیں لیکن ان کی جڑیں ہندوستان میں ہیں۔ میڈیکل کے پیشے سے جڑے ہونے کے باوجود انھوں نے اردو زبان و ادب کی ثروت میں گراں قدر اور قابل رشک اضافے کیے ہیں۔ اب تک ان کی 60 سے زائد ادبی، تحقیقی اور تنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں ان کا نام بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ انھوں نے یوم ثقافتی اتحاد کی مناسبت سے کہا کہ قومی اردو کونسل جلد ہی اردو میں دیگر مذاہب کی کتابوں کے حوالے سے ایک کل ہند سمینار کا انعقاد کرے گی تاکہ ثقافتی اتحاد کو مزید مستحکم کیا جا سکے۔

اردو اکادمی کے وائس چیرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدرِ شعبۂ اردو شہپر رسول نے اس موقعے پر کہا کہ ڈاکٹر تقی عابدی بڑے ادیب اور فعال شخص ہیں اور اردو کے لیے اہم کام کر رہے ہیں۔ جس موضوع پر وہ لکھتے ہیں، بھرپور لکھتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا اردو کی نئی بستیوں میں اردو کے حوالے سے کافی کچھ کام ہو رہا ہے مگر ہنوز مزید کام کی ضرورت ہے۔ آخر میں قومی اردو کونسل کے اسسٹنٹ ایڈیٹر ڈاکٹر عبدالحی نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر تقی عابدی نے جامع خطبہ پیش کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر شہزاد انجم، منصور احمد عثمانی، اے رحمٰن (ایڈووکیٹ)، جناب عقیل احمد (سکریٹری غالب اکادمی)، ڈاکٹر ندیم احمد، ڈاکٹر نوشاد عالم، ڈاکٹر مجیب احمد، ڈاکٹر شاذیہ عمیر، ڈاکٹر شفیع ایوب، ڈاکٹر علاء الدین خان، زبیر خان سعیدی، رکن الدین، شاداب شمیم، امیر حمزہ، طفیل علیمی، سمیت جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی یونیورسٹی اور جے این یو کے ریسرچ اسکالر اور قومی اردو کونسل کے تمام اسٹاف بھی موجود تھے۔

(رابطہ عامہ سیل)

پروفیسر گوپی چند نارنگ

(سرپرست)

اڈیٹوریل بورڈ

پروفیسر علی احمد فاطمی

ناقد، مصنف (شعبۂ اردو، الٰہ آباد یونیورسٹی، الٰہ آباد)

پروفیسر ابن کنول

ناقد، فکشن رائٹر (شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی)

پروفیسر شافع قدوائی

مستند اردو اسکالر (علیگڑھ)

سید محمد اشرف آئی آر ایس

فکشن رائٹر (کولکاتا)

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ناقد، مصنف (غازی آباد)

ڈاکٹر زیبا محمود

ناقد، مصنف (صدر شعبۂ اردو، جی ایس پی جی کالج، سلطانپور)

ڈاکٹر اجے مالوی

ناقد، مصنف (الٰہ آباد)

پروفیسر ستیہ پال آنند

ناقد، شاعر، مصنف (یو ایس اے)

ڈاکٹر تقی عابدی

فکشن نگار، شاعر، مصنف (کنیڈا)

ڈاکٹر بیدار بخت

فکشن نگار، ناقد، شاعر (کنیڈا)

پروفیسر ناصر عباس نیر

ناقد اور مصنف، پاکستان

جناب اشفاق حسین

ناقد اور شاعر (کنیڈا)

پروفیسر سویامین

ناقد، شاعر (جاپان)

ڈاکٹر محمد ابراهیم

ناقد، مصنف (صدر شعبۂ اردو، الازہر یونیورسٹی، مصر)

ڈاکٹر محمد سلیم

اڈیـــــــــــــــٹـــــــــــــــر

ریویو بورڈ اور ایڈوائزری بورڈ sabaqeurdu.com پر ملاحظہ فرمائیے۔